ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ

(چراغ آفریدم کے حوالے سے)

مقالہ برائے مقالہ ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

سدرہ طاہر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۱۹ء

ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ

(چراغ آفریدم کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

سدرہ طاہر

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ

(چراغ آفریدم کے حوالے سے)

پیش کار: سدرہ طاہر　　　　رجسٹریشن نمبر: 1319/M/U/S17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رخشندہ مراد: ----------------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان : ----------------

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئیر محمد ابراہیم : ----------------

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: --------------

اقرار نامہ

میں، سدرہ طاہر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

سدرہ طاہر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۱۹

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر

Abstract

I have attempted this research to analyze, evaluate and critically appreciate the contribution of Dr. Nasir Abbas Nyyar in the field of "Personal Essay" that was called "Inshaaiya" in Urdu language. The topic of my research/thesis is "Nasir Abbas Nyyar K Inshaaiyoun ka Mozuyati Aur Asslobi Mutala"

In which I critically Analyze the style and topics of Nasir Abbas Nyyar in the field of Urdu Inshayia.Nasir Abbas Nyyar is a well-known Urdu language short Story writer, Famous critic, columnist and essayist.

About the topic therefore it has been divided into four chapters.

In the first chapter introduction of Nasir Abbas Nyyar has been presented. In which his birth, family, education professional life and his literary and critical work in Urdu has been discussed. In second part of this chapter the term "Inshayyia" and its rules in Urdu has been discussed through which we came to know about rules, genre and origin of this term. In the light of censorious definitions. In third part of this chapter short history of Urdu "Inshaaiya" has been discussed that indicates the effort and contribution of Dr. Wazir agah is promotion of Inshaaiya.

Second chapter is based on topics that reviled in "chargh Affridm" that was categorized in social, physiological, literary, Sufism, morality and philosophical which shows attentions towards the interactions and feelings of person in social life. In the third chapter, we get to know about the writing style of Nasir Abbas Nyyar in the light of mention rules of Inshayia.At the end last chapter is based on whole research analysis of the thesis.

اظہارِ تشکر

اللہ پاک کی خاص مہربانی سے میں اپنے ایم۔فل کے مقالے بعنوان "ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ" کے تکمیلی مراحل تک پہنچ سکی اس کے لیے میں اللہ کے حضور جتنے بھی شکرانے کے نوافل ادا کروں کم ہیں یہی وہ ذات ہے جس نے مجھے وہ اسباب مہیا کئے جن کی بدولت میں اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔

اللہ کی ذات کے بعد جو ہستی سب سے زیادہ شکریے کی مستحق ہے وہ میرے والد محترم ہیں جنہوں نے نہ صرف باپ ہونے کا فرض نبھایا بلکہ ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داریاں نبھائیں میں ان کی ڈھیروں قربانیوں، تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کے لیے ساز گار ماحول فراہم کرنے، محبتوں اور شفقتوں کے لیے شکر گزار ہوں۔ جہاں میں اپنے والد کی بے حد شکر گزار ہوں وہیں اپنی بہن عارفہ طاہر کی جس نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے بری الذمہ کیا اور میرے حصے کا بھی کام کرتی رہی تاکہ میں اپنا کام مکمل کر سکوں۔ دادا ابو (بشیر احمد فانی) اور چچا جان (محمد طارق فانی ایڈوکیٹ) کی بھی شکر گزار ہوں۔

اساتذہ کرام جن کا مقام و مرتبہ والدین سے بھی بڑھ کر ہے اس سلسلے میں اپنے بچپن کے اساتذہ سے لے کر تمام اساتذہ جنہوں نے مجھے علم کا ایک حرف بھی سکھایا جس کی بدولت میں آج اس مقام تک پہنچ سکی ان سب کا شکریہ بشمول ان تمام ہستیوں کے جنہوں نے میرے اس مقالے کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ شکریے کے اس سلسلے میں بطور خاص ڈاکٹر روبینہ شہناز (صدرِ شعبہ اردو نمل) جو نہ صرف شفیق استاد ہیں بلکہ محبت و شفقت کا پیکر ہیں ان کی محبت میرے لیے قابل فخر ہے۔ آپ ہمیشہ طالب علموں کے مسائل بغور سنتی اور حل کرتی ہیں۔ میرے اس مقالے کی تکمیل تب ہی ممکن ہوئی جب انہوں نے مجھے ناصر عباس نیر کے انشائیوں پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور ڈاکٹر عابد سیال نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔ میری نگران مقالہ ڈاکٹر رخشندہ مراد کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ جن کے قیمتی وقت دینے اور رہنمائی کے بغیر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ مجھے جس لمحے بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی

وہ میری مدد اور تحقیقی رہنمائی کے لیے موجود رہیں۔ میں اپنی محترم استاد انجم مبین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور کام احسن طریقے سے کرنے کی طرف مائل رکھا۔

نمل یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کرام (ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر عنبرین شاکر جان، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر نازیہ ملک، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر ارشاد بیگم) جن کی رہنمائی، محبت اور شفقت نے مجھے ہمت اور حوصلہ دیا۔ ان تمام ہستیوں کی رہنمائی، تربیت اور محبتوں کا بہت شکریہ۔ ان کا ایسا رویہ سکالرز کو اپنا کام جاری رکھنے کا حوصلہ دیتا ہے اور میرے تعلیمی سفر میں بھی مشعل راہ ثابت ہوا۔

اپنے اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں ان احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری خیال کرتی ہوں جو نہ صرف میرے ہم جماعت ہیں بلکہ انہوں نے مقالے کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ جن میں عرفان طارق، محمد جمیل، محمد رضا، صبا وحید، سمعیہ شکور بالخصوص شیما سعدیہ کی شکر گزار ہوں۔ ایک اور شخصیت محمد یوسف جنہوں نے مجھے اس تحقیقی کام میں مواد اور کتابوں کی جمع آوری اور پی ڈی ایف کتابوں کے پرنٹ کے لیے میری مدد کی میں ان کی شکر گزار ہوں۔

ان شخصیات کے علاوہ میں صاحبِ موضوع ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے تعاون کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں اور ڈاکٹر سکندر حیات میکن جن کا خلوص ہی تھا کہ میرے ایک فون کال کے فوری جواب میں میرے تحقیقی کام سے متعلقہ مواد فوراً ارسال کیا۔ میں ان تمام ہستیوں کے تعاون کی بے حد شکر گزار ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا ان تمام شخصیات کو دنیا و آخرت میں سرخرو کرے۔ آمین۔

سدرہ طاہر

سکالر ایم فل اردو

باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

ii۔ بیان مسئلہ

iii۔ مقاصد تحقیق

iv۔ تحقیقی سوالات

v۔ نظری دائرہ کار

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

viii۔ تحدید

ix۔ پس منظری مطالعہ

x۔ تحقیق کی اہمیت

ب۔ انشائیہ نگار: تعارف (ناصر عباس نیر)

ج۔ فن انشائیہ نگاری اور اس کے بنیادی اصول

د۔ اردو میں انشائیہ نگاری: پس منظری مطالعہ

حوالہ جات

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

میرے ایم۔ فل کے مقالے کا مجوزہ موضوع ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ ہے۔ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا مجموعہ "چراغ آفریدم "ہے۔انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی طرح لگتی ہے لیکن یہ ایک الگ انداز کی حامل ہے۔اس میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنی تحریر پیش کرتا ہے اور بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے بات کو ختم کر کے نتیجہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں انشائیہ ادبی صورت اختیار کرتا ہوا منظر عام پر آتا ہے۔ دیگر اصناف ادب کی طرح انشائیہ نگاری کی طرف رجحان اور دلچسپی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ میرا مجوزہ موضوع ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ محنت اور توجہ کا متقاضی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی سطح پر بھی اہمیت کا حامل ہے

"چراغ آفریدم "میں ۳۴انشائیے شامل ہیں ۔یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۲۰۰۰ءمیں منظر عام پر آیا۔ دوسری اشاعات ۹ انشائیوں کے اضافے کے ساتھ ۲۰۱۴ میں ہوئی۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر معروف نقاد،افسانہ نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ آپ کو تنقید کے میدان میں بڑی شہرت حاصل ہوئی لیکن ان کی انشائیہ نگاری بھی اپنی پہچان آپ لیے ہوئے ہے۔ تازگی ان کے انشائیے کی خاص پہچان ہے۔وہ ایک جملے میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع اور اسلوب تحقیق کا متقاضی ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

ناصر عباس نیر عصر حاضر کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔میرا تحقیقی کام ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی تجزیہ کرنا اور ناصر عباس نیر کو بحیثیت انشائیہ نگار متعارف کروانا ہے۔ان کے انشائیوں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے اور ان کا اسلوب سادہ، شگفتہ اور رواں ہے۔ فلسفیانہ نظریات اور اظہار کا بے باک انداز ان کے انشائیوں کی پہچان ہے یہی وجہ ہے کہ مجوزہ موضوع ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ ہے۔اس موضوع کی اہمیت ادب کے میدان میں گراں قدر اضافہ ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

الف۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لینا۔

ب۔ "چراغ آفریدم" کا موضوعاتی تجزیہ کرنا۔

ج۔ "چراغ آفریدم" کا اسلوبی تجزیہ کرنا اور زبان و بیان کا جائزہ لینا۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیقی موضوع ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گئے ہیں۔

۱۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے موضوعات کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ ناصر عباس نیر کا اسلوب بیان کیسا ہے اور اسکی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا اسلوب انشائیہ نگاری کے متعین اسلوب سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی موضوع ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ کے پیش نظر ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا مطالعہ کر کے ان کے منفرد موضوعات سماجی، نفسیاتی، اخلاقی، فلسفیانہ اور تصوف پر مبنی موضوعات کو ناصر عباس نیر کی نظر سے دیکھنا اور ان کے اسلوب بیان کو واضح کرنا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے مجموعے "چراغ آفریدم" پر انحصار کیا جائے گا۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ بنیادی ماخذ تک رسائی کے لیے "چراغ آفریدم" ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا مجموعہ جو ۲۰۱۴ء میں بیکن بکس ملتان سے شائع ہوا۔ اس کو ملتان سے بذریعہ ڈاک حاصل کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذ تک رسائی کے بعد ڈاکٹر ناصر عباس

نیر کی حالات زندگی اور شخصیت سے آگاہی کے لیے ڈاکٹر ناصر عباس نیر ان کے احباب اور دیگر ادیبوں سے انٹرویوز کو بھی شامل تحقیق کیا جائے گا۔ انٹرویوز، کانفرنس، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق ہے۔ جن میں سے چند کی فہرست ثانوی کتب میں دی گئی ہے۔ ان کتب کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ انشائیہ نگاری کی صنف میں متعین کردہ اصولوں کے تحت ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے موضوعات اور اسلوب کو پرکھا جا سکے۔ مزید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

مجوزہ موضوع ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ پر ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی یعنی کسی بھی سطح پر کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ بر عکس اس کے اس صنف انشائیہ نگاری کے حوالے سے اور دیگر انشائیہ نگاروں کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کام وقت کے ساتھ ساتھ جاری و ساری ہے۔ مثلاً سائرہ بتول کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ " پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ(۱۹۶۰ء تا حال) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء" اس کے علاوہ تقریباً ہر انشائیہ نگار کے موضوعات اور اسلوب پر انفرادی حیثیت میں بھی کام ہو رہا ہے۔ میرے مقالے کا مجوزہ موضوع بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

viii۔ تحدید:

ناصر عباس نیر نے بطور تنقید نگار، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار شہرت پائی لیکن زیر نظر میرے ایم فل کے مقالے کا مقصد صرف ان کے انشائیوں کے مجموعے "چراغ آفریدم" کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ تک محدود ہے۔ یہ تصنیف ۳۴ انشائیوں پر مشتمل ایک کتاب ہے۔ اس میں سے ان کے موضوعات جن میں اخلاقی، نفسیاتی، فطری، فلسفیانہ اور تصوف پر مبنی موضوعات زیر بحث ہوں گے اس کے ساتھ ساتھ ناصر عباس نیر کا اسلوب بیان اور انشائیوں میں استعمال کی جانے والی مختلف تکنیکوں کو بھی زیر بحث لایا جائے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور پر اردو انشائیہ نگاری کی روایت اور تحقیقی مقالہ جات کو سامنے رکھا جائے گا۔انشائیہ نگاری کی بنیادی کتب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔جن میں ڈاکٹر انور سدید "انشائیہ اردو ادب میں"،ڈاکٹر سلیم اختر "اردو میں انشائیہ نگاری"،ڈاکٹر بشیر سیفی "انشائیہ کی بنیاد" اور اکبر حمیدی کی "جدید اردو انشائیہ" وغیرہ جیسی اہم کتب شامل ہیں۔ان کتب کے مطالعے سے اردو ادب میں اردو انشائیہ اور جدید اردو انشایئے کی روایت پر روشنی ڈالنے میں مدد ملے گی۔اس کے علاوہ انشائیہ نگاری کے صنفی اور فنی لوازم کیا کیا ہیں ان کے اختلافات و اشتراکات کا تعین کس طرح کیا گیا ہے ان تمام مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے انشایئے کی تعریف کا تعین کیا جائے گا اور نامور محققین کی کتب کے مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی واسلوبی تجزیہ کیا جائے گا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

ناصر عباس نیر اردو ادب کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔کسی بھی تخلیقی سرمائے کی بنیادی شرط تازگی ہوتی ہے۔اگر اس فن پارے میں تازگی نہیں تو وہ فن پارہ پرانے موضوعات والفاظ سے باہر نہیں نکل پاتا تو اس کے ہونے کا جواز نہیں بنتا۔ ناصر عباس نیر کی تخلیقات میں تازگی ایک اہم عنصر ہے۔اگر ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو تازگی اور مختلف اسلوب ان کی اولین خصوصیت قرار پاتا ہے۔انھی بنیادوں پر وہ اپنے آپ کو ہم عصروں سے ممتاز بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔اس تحقیق سے ناصر عباس نیر کے انشائیوں کی تفہیم ہو گی۔

ب۔ انشائیہ نگار: تعارف (ناصر عباس نیر)

ناصر عباس نیر عصر حاضر کی اہم ادبی شخصیت ہیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اصل نام ناصر عباس اور قلمی نام ناصر عباس نیر ہے۔ اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے کی وجہ سے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ ہوتا ہے لہذا ادب کے میدان میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء میں دریائے چناب کے کنارے آباد وسطی پنجاب کے ضلع جھنگ (پاکستان) میں ہوئی۔ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق اسی ضلع اور زمیندار گھرانے سے ہے۔ ناصر عباس نیر کے والد محترم کا نام محمد عبد اللہ ہے جو ایک محنتی اور باوقار زمیندار تھے اور ساتھ میں گھرانے کا نظام بہترین طریقے سے چلانے اور اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور اس پر آنے والے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے لیے کاروبار کرتے تھے لیکن حالات کی تند و تیز دھارے میں ان کی زمینیں اور کاروبار نہ رہے۔ اس کے بعد محمد عبد اللہ نے پرسکون اور آرام دہ زندگی اپنے چشم و چراغ ناصر عباس نیر کے سنگ گزاری اور ۱۴ مئی ۲۰۱۹ کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ناصر عباس نیر ستمبر ۲۰۱۸ء میں اپنے والد کا تعارف کرواتے ہوئے انٹرویو میں کہتے ہیں۔

> "والد صاحب کی کچھ زمینیں تھیں اور معمولی کاروبار۔ چند سال پہلے دونوں باقی نہ رہے۔ والد صاحب حیات ہیں اور آرام دہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج میں جس مقام پر بھی ہوں یہ والد صاحب ہی کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔"(۱)

وہ مادر عظیم جس کی کوکھ سے ناصر عباس نیر نے جنم لیا ان کا نام اللہ جوائی تھا جو اس جہان فانی سے ۲۰۰۳ء میں رخصت ہو گئیں۔ آپ چھ بہن بھائی ہیں۔ ناصر عباس نیر تین بھائیوں سے بڑے اور دو بہنوں سے چھوٹے ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی بہن شہناز تھیں۔ جو ۱۹۹۳ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ آپ کی دوسری بہن ممتاز ہیں جو خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بہنوں کے بعد ناصر عباس نیر کا نمبر آتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے تین بھائیوں کے اسماء گرامی انصر عباس، غضنفر عباس اور ظہیر عباس ہیں اور یہ حضرات رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں اور معاشی لحاظ سے توانا ہیں۔

بقول ناصر عباس نیر:

"بہنیں مجھ سے بڑی ہیں بھائیوں میں میں بڑا ہوں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ دو بھائی اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ جب کہ چوتھا اور سب سے چھوٹا بھائی انجینئر ہے اور جنوبی افریقہ میں ایک کثیر القومی کمپنی میں مینجر ہے۔"[۲]

ناصر عباس نیر ۱۹۹۵ء میں ازدواجی زندگی سے منسلک ہوئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ طاہرہ عصمت ایک نفیس اور نیک دل خاتون ہیں۔ خدا نے آپ کو دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کے بڑے بیٹے ارمغان احمد سوفٹ وئیر انجنیئرنگ کے آخری سال میں، چھوٹے بیٹے اسامہ علی بی۔ ایس انگلش کے پانچویں سمسٹر میں اور آپ کی بیٹی اریب شہناز نویں جماعت کی طالبہ ہے۔

انسانی زندگی میں تعلیم کی ضرورت و اہمیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ تعلیم ہی انسان کو شعور فراہم کرتی ہے اور زمین کی پستیوں سے نکال کر آسمان کی بلندیوں تک لے جاتی ہے تعلیم انسان کی سیرت و کردار کی اس طرح تعمیر و تشکیل کرتی ہے کہ وہ معاشرے میں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی ایک کامیاب شہری کی حیثیت سے بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے مختلف شہروں اور یہاں تک کہ بیرونی ممالک کا سفر بھی کیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم میٹرک تک اپنے آبائی گاؤں جھنگ سے اٹھاون کلو میٹر جنوب میں واقع ایک قدیم اور تاریخی شہر شور کوٹ سے حاصل کی۔ ایف ایس سی ۱۹۸۵ اور بی اے کا امتحان ۱۹۸۷ میں جھنگ سے پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ فیصل آباد چلے گے یہاں آپ نے گورنمنٹ کالج جو اب ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے یہاں ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۹ء میں ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ ۲۰۰۰ء میں پرائیویٹ طالب علم کے طور پر ملازمت کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد سے ایم فل اردو میں داخلہ لیا اور ۲۰۰۳ء میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی آپ نے ایم فل کے تحقیقی مقالے کا عنوان "اردو تنقید میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث" رکھا۔ ایم فل اردو کے فوراً بعد پی ایچ ڈی اردو بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان سے ۲۰۰۷ء میں مکمل کی آپ کا پی ایچ ڈی اردو کا مقالہ بھی تنقیدی حوالے سے تھا اس مقالے کا عنوان "اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات" ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا نام اردو ادب میں جدید تنقید کے بانیوں میں ہے اور آپ کا یہ کام جس

اہمیت کا حامل ہے اس کی مثال ان کی تحریریں ہیں۔ کہا جاتا ہے تعلیم حاصل کرو چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ناصر عباس نیر نے اعلیٰ تعلیم تو حاصل کی لیکن یہ صرف پی ایچ ڈی تک محدود نہ رہی مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے جرمنی کا سفر کیا اور پوسٹ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۲۰۱۱ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی، جرمنی سے حاصل کی۔ آپ کی پوسٹ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے کیا گیا تحقیقی کام "نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات کے مابعد نو آبادیاتی مطالعے" پر مشتمل ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا انسان وقت کے ساتھ نئی سے نئی چیزیں سیکھتا رہتا ہے یوں اس کے علم اور فن میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے ڈگری حاصل کرنا اپنی بات کو منوانے کا ایک پُر اثر طریقہ ہے جس کہ لیے ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ڈاکٹریٹ کے بعد پوسٹ ڈاکٹریٹ تک کا طویل سفر طے کیا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ایم۔اے اردو تک تعلیم حاصل کرنے کے فوراً بعد ملازمت تلاش کی۔ ان کی یہ تلاش نہ صرف مکمل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے بلکہ اس سلسلے میں کامیابی کی بلندیوں تک پہنچے۔ یہاں یہ بھی واضح ہوتا چلے کے انسان کے لیے تعلیم حاصل کرنا صرف بہترین روزگار کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ ملازمت ایک روزگار یا نظام خواندگی کو بہتر طور پر چلانے کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ لہذا تعلیم ملازمت کے سلسلے کا ایک جز کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ملازمت کے سلسلے میں شعبہ تدریس سے وابسطہ ہوئے اور مئی ۱۹۹۳ء میں ایبٹ آباد پبلک سکول و کالج میں بطور لیکچرار اردو ایک سال دو ماہ (جولائی ۱۹۹۴) تک خدمات سر انجام دیں۔ اس کے بعد ۴ ستمبر ۱۹۹۴ء سے ۲۸ فروری ۲۰۰۵ء تک بطور لیکچرار اردو سرکاری کالجوں میں تدریسی فرائض سر انجام دیتے رہے۔ ان کالجوں میں جامع محمد شریف، ٹوبہ ٹیک سنگھ، شور کوٹ اور جھنگ کے سرکاری کالج شامل ہیں۔ پی ایچ ڈی اردو کے بعد ۱۶ جون ۲۰۰۸ء سے ۱۵ جون ۲۰۱۶ء تک بطور اسسٹنٹ پروفیسر اور ۱۶ جون ۲۰۱۴ سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر (ٹی ٹی ایس) شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور میں تدریسی فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۶ میں آپ کو اردو سائنس بورڈ، لاہور میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز کیا گیا ڈاکٹر ناصر عباس نیر یہ تمام فرائض نہایت خندہ پیشانی سے سر انجام دے رہے ہیں۔

ناصر عباس نیر کی شخصیت ہمہ جہت خوبیوں کی حامل ہے۔ آپ نے کبھی اپنے عہدے پر غرور نہیں کیا۔ ہر ایک سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ادبی کانفرنسوں میں شرکت فرما کر محفل کی شان بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ نے پچاس کے قریب ملکی اور غیر ملکی سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت اور لیکچرز دیے۔

"ڈاکٹر ناصر عباس نیر تقریبات میں شرکت نہیں کرتے سوائے ادبی کانفرنسوں کے۔ وہ ہمیشہ وقت کے قدرے ہیں اور اپنا وقت ادبی اور مثبت پہلوؤں پر صرف کرتے ہیں۔"(۳)

ناصر عباس نیر اپنی نجی زندگی میں ایک زندہ دل اور مجلسی انسان ہیں۔ ان سے میری پہلی مرتبہ ملاقات ۲۶ اپریل ۲۰۱۸ء میں نیشنل یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہونے والی دو روزہ بین الاقوامی اردو کانفرنس بعنوان "اردو نقد و تحقیق: رجحانات کا عصری و عالمی تناظر" میں ہوئی۔ اس محفل میں پہلی مرتبہ اس باوقار شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ یہ انتہائی مختصر ملاقات تھی لیکن میں نے ان کا جو اخلاق طالب علموں کے ساتھ پایا اس کی مثال ان سے ملنے والا ہر فرد دے گا۔ جس سے باخوبی ان کی ذات کا وہ عنصر نمایاں ہوتا ہے جو معاشرے میں ان کا مقام متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کو کتاب کی انفرادیت کا بخوبی اندازہ ہے آپ کتاب دوست ہیں۔ آپ کے مشاغل میں سب سے زیادہ اہمیت کتاب کے مطالعہ کو حاصل ہے۔ کتاب فرد کی بہترین دوست سراپا اخلاق ہے جو فرد سے کبھی بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتی۔ اس کی اہمیت، افادیت اور عظمت کے سائے تلے ہی علم و دانش کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب دوستی کا اندازہ ڈاکٹر سکندر حیات میکن کے مطابق اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"کتابوں کے معاملے میں جو فیاضی ان میں دیکھی گئی شاید ہی کسی میں ہو۔ میرے لیے ان کی کتب کی الماریوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھارت سے شائع ہونے والی اچھی اور نادر

کتب کا ایک ذخیرہ موجود ہے جو شاید ہی پاکستان میں کسی اور ادیب کے
پاس ہو۔"[۴]

ناصر عباس نیر کو زمانہ طالب علمی سے ہی اردو ادب سے خاص شغف تھا۔ کتاب سے محبت کا یہ عالم تھا کہ دن رات کہیں بھی جانا ہو کتاب آپ کے ساتھ ہوتی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کے بہت جلد آپ کی پہلی تنقیدی کتاب ۱۹۹۳ء "دن ڈھل چکا تھا" کے نام سے شائع ہوئی۔ ناصر عباس نیر کی تنقید کے میدان میں خاطر خواہ خدمات میں اور آپ کی تنقیدی کتب میں ۱۳ کتابیں تنقید کے میدان میں آپ کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کتب کی فہرست یہ ہے:

۱۔ دن ڈھل چکا تھا، (مکتبہ نردبان، سرگودھا، ۱۹۹۳ء)

۲۔ جدیدیت سے پس جدیدیت تک، (کاروان ادب، ملتان، ۲۰۰۰ء)

۳۔ معمار ادب: نظیر صدیقی، (مسز نظیر صدیقی، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء)

۴۔ جدید اور مابعد جدید تنقید: مغربی اور اردو تناظر میں، (انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۲۰۰۴ء، ۲۰۱۳ء)

۵۔ مجید امجد: شخصیت اور فن، (اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۰۸ء)

۶۔ لسانیات اور تنقید، (پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۴)

۷۔ متن، سیاق اور تناظر، (پورپ اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۲ء)

متن، سیاق اور تناظر، (براؤن پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۴ء)

متن، سیاق اور تناظر، (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۶ء)

۸۔ مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں، (آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۲۰۱۳ء)

۹۔ ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، (کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۴ء)

۱۰۔ مجید امجد: حیات، شعریات، جمالیات، (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء)

۱۱۔ عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین، (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۵ء)

۱۲۔ اردو ادب کی تشکیل جدید: نو آبادیاتی اور پس نوآبادیاتی مطالعات، (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۲۰۱۲ء)

۱۳۔ اس کو اک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں (میراجی کی نظم اور نثر کا مطالعہ)، (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۲۰۱۷ء)

اردو ادب میں جدید تھیوریز پر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی مرتب کردہ تنقیدی کتابوں میں پانچ کتابیں شامل ہیں جن کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ ساختیات: ایک تعارف، (مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور ۲۰۰۶ء)

ساختیات: ایک تعارف، نظر ثانی شدہ ایڈیشن، (پورب اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۱ء، ۲۰۱۵ء)

۲۔ مابعد جدیدیت: نظری مباحث، (مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور ۲۰۰۷ء)

مابعد جدیدیت: نظری مباحث، (بیکن بکس، ملتان ۲۰۱۴ء)

۳۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اردو زبان و ادب (بہ اشتراک)، (کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۲۰۰۷)

۴۔ مابعد جدیدیت: اطلاقی جہات، (مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور ۲۰۰۸ء)

۵۔ آزاد صدی مقالات (بہ اشتراک تحسین فراقی) (شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۲۰۱۰ء)

آپ کے تخلیقی سرمائے میں (افسانوی مجموعہ) خاک کی مہک، (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۶ء)، (سفر نامہ /ڈائری) ہائیڈل برگ کی ڈائری، (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۷ء)، آپ نے تراجم بھی کیے اس سلسلے میں "ارسطو کی تاریخ (کیرن آرمسٹرانگ) (مشعل بکس، لاہور سے ۲۰۱۳) میں شائع ہونے والی کتاب اہمیت کی حامل ہے، انشائیوں کے حوالے سے آپ کی انشائیوں کی کتاب چراغ آفریدم کے نام سے ۲۰۰۰ء میں (کاغذی پیرہن، لاہور) سے شائع ہوئی اس کے بعد ترمیم اور چند انشائیوں کے اضافے سے ۲۰۱۴ میں (بیکن بکس، ملتان) سے چھپی۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبار دی نیوز (The News) میں ادب، تاریخ اور ثقافت کے حوالے سے مضامین اور کالم لکھے۔ جو آپ کی ادب میں ہمہ جہت شخصیت کی بڑی مثال ہے۔

اس سب کے علاوہ بہت سے تنقیدی مضامین مرتبہ کتب میں شائع ہو چکے ہیں جن کی تفصیل درجہ ذیل ہے۔

۱۔ "فراق کی تنقید" مشمولہ گورکھ پوری ،شاعر اور دانشور، (مرتبہ گوپی چند نارنگ)، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۷ء

۲۔ "نوآبادیاتی صورت حال" مشمولہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اردو زبان و ادب (مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الحسن و ناصر عباس نیر) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۷ء

۳۔ "نئی تنقید" مشمولہ نظریاتی تنقید، (مرتبہ ابوالکلام قاسمی)، ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

۴۔ "آزاد کے لسانی تصورات" مشمولہ آزاد صدی مقالات، (مرتبہ تحسین فراقی و ناصر عباس نیر) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۲۰۱۰ء

۵۔ "راشد کی نظم اسرافیل کی موت: تجزیاتی مطالعہ" مشمولہ کس دھنک سے مرے رنگ آئے (مرتبہ ڈاکٹر تحسین فراقی، ضیاء الحسن) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء

۶۔ "اردو میں وسطی جدید تنقید" مشمولہ ارمغان افتخار امام صدیقی، (مرتبہ رفیع الدین ہاشمی و عزیز ابن الحسن)، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء

۷۔"رومانویت"مشمولہ ارمغان رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ (ڈاکٹر خالد ندیم)،لاہور،۲۰۱۳ء

۸۔"ما بعد نائن الیون دنیا اور منٹو"مشمولہ منٹو اور ہم (مرتبہ الطاف احمد قریشی،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۲۰۱۳ء

۹۔"امداد امام اثر کی تنقید"مشمولہ امام اثر: شخصیت اور تنقید تصورات (مرتبہ امتیاز عالم)،ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی،۲۰۱۴ء

۱۰۔"عام آدمی کے خواب"مشمولہ نیا اردو افسانہ (مرتبہ یاسمین حمید)،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور ۲۰۱۴ء

۱۱۔"معاصر پاکستانی اردو تنقید کا خاکہ"مشمولہ تھیوری اور شعریات (مرتبہ ڈاکٹر مشتاق صدف)دہلی،۲۰۱۴ء

۱۲۔"وطن اور جلا وطنی"مشمولہ چنوا اچیبے :ادب،فکر اور فن کا مطالعہ(مرتبہ ایم خالد فیاض)بک ٹائم،کراچی،۲۰۱۴

۱۳۔"اکیسویں صدی میں اردو تنقید"مشمولہ اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ (مرتبہ خواجہ محمد اکرام الدین)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،۲۰۱۴ء

۱۴۔"غالب ہمارا لازمانی معاصر"مشمولہ انتخاب مخزن (دور جدید،۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۳ء)مرتبہ انور سدید، مجلس ترقی ادب،لاہور

۱۵۔"اردو انشائیے کی شعریات"مشمولہ انتخاب مخزن (دور جدید،۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۳ء)مرتبہ انور سدید، مجلس ترقی ادب،لاہور

ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے قومی اور بین الاقوامی ادبی رسائل و جرائد میں بہت سے مقالات تحریر کیے جن کی تعداد لگ بھگ ۱۰۰ کے قریب ہے۔اس کے علاوہ آپ کے ساٹھ کے قریب ایسے مقالات ہیں جو ہائر ایجوکیشن کمیشن(HEC)سے منظور شدہ جرائد میں شائع ہوئے۔[۵]جب بھی کسی نے ترقی کی منازل طے کی اس کے پس پردہ عوامل میں محنت اور لگن ہی کار فرما رہی۔ابتدا ہی سے وہ اپنے مقاصد کی

تکمیل میں کمربستہ نظر آتا ہے۔ یہی چیز ہمیں ناصر عباس نیر کی حالات زندگی جاننے سے بڑے واضح انداز میں نظر آتی ہے کہ انہوں نے ابتدا ہی سے سخت محنت کی اور آج جس مقام پر ناصر عباس نیر فائز ہیں یہ ان کی زندگی بھر کی محنت کا ثمر ہے۔ جو کسی طور پر ختم نہیں ہوا بلکہ وہ مسلسل ادب کی خدمت میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

ج۔ فن انشائیہ نگاری اور اس کے بنیادی اصول

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا چلا جاتا ہے اور اتنی ہی تیزی و تندی سے حالات میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ان بدلتے حالات کا ادب اور ادیب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ادب ہر دور کے حالات کے مطابق نہ صرف اثر قبول کرتا ہے بلکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق نئی اصناف کو بھی جگہ دیتا ہے اور یہ اصناف یا تو دوسری زبانوں کے ادب سے مستعار لی جاتی ہیں یا تو وقت کے تقاضوں کے مطابق تخلیق کو ناقدین اس کی خصوصیات کے اعتبار سے کسی نئی صنف کا نام دے دیتے ہیں۔ انشایئے پر بات کی جائے تو یہ جدید دور میں اردو ادب کی ایک اہم نثری صنف ہے۔ جس کا شمار غیر افسانوی نثر میں ہوتا ہے۔

فن انشائیہ نگاری اور اس کے بنیادی اصول بیان کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ انشائیہ کیا ہے؟ اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟ ہم مختصراً یہ بھی دیکھیں گئے کہ یہ صنف اردو ادب میں کہاں سے آئی؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کے جوابات کے لیے مختلف لغات، انسائیکلوپیڈیا، محققین اور تنقید نگاروں کی رائے پیش نظر ہو گی۔ اہل قلم نے اس صنف کی خصوصیات اور اصول وضع کرنے کے لیے اپنی اپنی ایک خاص رائے قائم کرتے ہوئے انشایئے کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا اس تحقیق کی ابتدائی بحث انشایئے کے لغوی اور اصطلاحی معنی پر ہو گی اس ضمن میں سب سے پہلے یہ دیکھنا کہ "انشائیہ" کے مختلف لغات میں معنی کیا ہیں؟ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟ بطور اصطلاح کب اور کیسے رائج ہوا؟

انشائیہ کے لغوی معنی نئی اردو لغت میں اس طرح درج ہیں:

"انشا: مونث؛ عبارت، مضمون لکھنے والا، منشی، اچھا مضمون نگار

انشائیہ: ۱: (نحو کی اصطلاح) ۲: انگریزی لفظ "ایسے" "Essay" کا مترادف ۳: مضمون۔"[۲]

فیروز اللغات اردو جامع میں انشائیہ کو انشا سے منسوب کرتے ہوئے غیر سنجیدہ تحریر یا مضمون کے پیش نظر اس طرح سے بیان کیا ہے۔

انشائیہ -(ان۔شا۔ء۔یہ)[ع صفت]انشا سے منسوب۔نحو کی اصطلاح
میں وہ جملہ جس میں سچ جھوٹ کا احتمال نہ ہو غیر سنجیدہ مضمون۔(۷)

اس معنی کی مشابہت "حسن اللغات اردو جامع "میں بھی ملتی ہے۔
"انشائیہ:وہ جملہ جس کے متکلم کو جھوٹا یا سچا نہ کر سکیں۔"(۸)

فرہنگ عامرہ میں انشائیہ کو انشا سے منسوب کرتے ہوئے انشا کے معنی عبارت یا بات بنانے کے ہیں۔

"انشاء:ان۔شاء۔عبارت لکھنا،بات پیدا کرنا۔انشائیہ:ان۔شا۔ی۔یہ
منسوب بہ انشاء۔"(۹)

ڈاکٹر وحید قریشی لفظ انشاء کی اصل کی جانب تحقیقی انداز اپناتے ہوئے کہتے ہیں:

"انشاء کا لفظ عربی زبان سے اپنی اصلاحی حیثیت کے ساتھ نازل ہوا ہے۔
انشاء کا لفظ ابتدا میں ایک دفتری اصطلاح تھا۔اس کا اطلاق سرکاری
فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا اور صاف شدہ مسودے کو
تحریر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔اس نے دیوان اور انشاء کا نام پایا۔رفتہ
رفتہ فرامین اور مکتوبات کی تحریر و ترتیب کے لئے انشا کا لفظ مستعمل ہو گیا
،یہی نثر احکام و فرامین و مکتوبات کی زبان قرار پائی۔اس نثر میں خطابت
کا عنصر جزو اعظم تھا۔اس سے انشاء پردازی کی وہ خاص نہج وجود میں آگئی
جس کو ہم انشائیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"(۱۰)

شان الحق حقی کی "فرہنگ تلفظ "میں انشا،انشائے لطیف اور انشائیہ کے معنی اس طرح سے بیان کیے گئے ہیں۔

"انشا:نگارش ،لکھائی،تحریر ،عبارت آرائی،مضمون نگاری، خطوط
نگاری۔

انشائے لطیف:ادبی تحریر جو لطف کلام کے لیے لکھی جائے خصوصاً رومانی

انشائیہ: ادبی مضمون [انگ؛ Essay]۔"[11]

وارث سرہندی کی علمی اردو لغت میں انشائیہ کو انگریزی ایسے کا ترجمہ قرار دیا گیا ہے۔

"انشائیہ: [ع امذ] ا۔ جملے کی ایک قسم جس میں صدق یا کذب کا احتمال نہ ہو۔ ہلکا پھلکا مضمون ۔ غیر سنجیدہ مضمون انگریزی (Essay) کا ترجمہ۔"[12]

انشائیہ کے لغوی معنی کے مطالعے سے جہاں یہ واضح ہوا کے یہ اصطلاح ایک خاص قسم کے مضمون کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ وہیں ہم دیکھتے ہیں کے انشایئے کے لیے انگریزی Essay کے ترجمہ کے طور پر لیا گیا ہے لہذا انشایئے کو مزید سمجھنے کے لیے ہم انگریزی "ایسے" کے معنی اگر ڈاکٹر جمیل جالبی کی قومی انگریزی لغت میں دیکھیں تو اس طرح ملتے ہیں۔

"Essay:

کاوش، سعی، کوشش، جہد، جواب مضمون انشاء، مضمون، تک و تاز، تک و دو، جانفشانی، محنت، کوئی کام انجام دینے کے لیے کی گئی کوشش، آزمائش، امتحان یا تجربہ، مختصر ادب پارہ، جس کا مقصد کسی خاص نکتے کا اثبات یا موضوع کی توضیح و تعبیر ہو۔ انشائیہ۔"[13]

فرہنگ ادبی اصطلاحات (Dictionary of Literary Terms English Urdu) میں Essay کی اصطلاح کو مضمون اور مقالے کے مترادف کے طور پر اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

"Essay:

مقالہ ایک یا ایک سے زیادہ موضوع پر باقاعدہ یا بے قاعدہ مختصر مضمون۔ یہ مضمون یا مقالہ عموماً نثر میں بھی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار

> نظم میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً پوپ کا An Essay on Criticism یا An Essay on Man ایسے مقالے قدیم ادب میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ Essai (کوشش) Montaigne نے پہلی بار اس صنف کے لیے استعمال کیا جب ۱۵۷۰ میں اس نے اپنے مقالوں کا مجموعہ شائع کیا۔ سترہ سال بعد Bacon نے اپنے مختصر فلسفیانہ مضامین کے لیے لفظ Essay کا استعمال کیا کے مقالے ،ذاتی ،بے تکلف اور لطیف ہیں۔"(۱۴)

ابو الا عجاز حفیظ صدیقی کی مرتب "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں انشائیہ کی اصطلاح کے متعلق جو وضاحت پیش کی گئی ہے وہ انشائیہ کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے جو انشائیہ کو دیگر مضامین اور مقالہ وغیرہ سے مختلف کرتی ہے۔

> "انشائیہ ایک اصطلاح کی حیثیت سے Essay کا ترجمہ ہے۔ پہلے پہل اسے بھی مضمون ہی کہا جاتا تھا لیکن مضمون ایک ایسی عام اصطلاح ہے جس کی حدود میں سوانحی مضمون ، تحقیقی مقالہ حتیٰ کہ اخبار کا مقالہ افتتاحیہ بھی شامل ہو جاتا ہے ۔ مضمون کی اس خاص قسم کے لیے کسی نئے لفظ کی ضرورت تھی چنانچہ وزیر آغا نے انشائیہ کا لفظ تجویز کیا جو اب اصطلاح کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔"(۱۵)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی" اصناف ادب" میں انشائیہ کو انگریزی سے در آمد شدہ جدید نثری صنف قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> "یہ نوخیز صنف نثر انگریزی ادب سے درآمد کی گئی ہے اور انگریزی Essay کی ایک شکل ہے۔ موضوع کی ندرت اور تکنیک کی جدت کے اعتبار سے اردو کی تمام نثری اصناف سے مختلف ہے۔۔۔ اردو میں انشائیہ

ایک جدید صنف نثر کی حیثیت سے جس انداز میں ہمارے سامنے آیا ہے
اس کا انگریزی انشائیے کی روایت سے گہرا تعلق ہے۔ انشائیہ کا موجد
ایک فرانسیسی مصنف مونتین ہے۔"[۱۶]

انشائیہ کے لغوی معنی مختلف لغات میں دیکھنے کے بعد یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ کا لفظ انشا سے نکلا ہے۔ عربی زبان کا لفظ جو عبارت طرز تحریر، لکھائی وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا انشائیہ کو انشا سے منسوب کیا گیا ہے جس کو انگریزی لفظ Essay کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور Essay کو فرانسیسی لفظ Essai جس کی اصل بھی عربی لفظ "سعی" سے ملتی ہے۔ یہ بھی ایک طویل بحث ہے۔ انگریزی میں Essay فرانسیسی Essai سے آئی لیکن یہاں ہم مختصراً اردو میں انشائیہ کیا ہے پر بات کر رہے تھے۔ جس سے ثابت ہوا انشائیہ ایسی تحریر ہے جس میں باقاعدہ مضمون ہو۔ اس کے اصطلاحی معنی کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نثری صنف ادب ہے۔ اور ایک خاص قسم کے مضمون کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی اصطلاح استعمال کی جو کہ مستعمل اور رائج ہو گی۔ لیکن اس سے متعلق بھی اعتراضات کیے گئے ہیں کہ وزیر آغا سے پہلے بھی انشائیہ اپنے اصل معنی میں استعمال ہو رہا تھا جس کے لیے ناقدین نے مختلف مثالوں سے وضاحتیں پیش کی ہیں۔ جو قابل ذکر ہیں۔ وزیر آغا سے قبل انشائیہ کی اصطلاح محمد حسین آزاد کے مکاتیب کے مجموعہ میں ملتی ہے لیکن اس میں یہ اصطلاح انشاپردازی کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اصطلاح سب سے پہلے اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کی کتاب "ترنگ" کے دیباچہ میں بھی انشائیہ کی اصطلاح پہلی مرتبہ مضمون اور انشائیہ کے معنی میں استعمال کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر وزیر آغا کی اولیت پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی کتاب انشائیے کی بنیاد میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وزیر آغا سے بہت پہلے نہ صرف یہ کہ انشائیے لکھے جا رہے تھے
بلکہ انشائیہ کی اصطلاح بھی معرض وجود میں آچکی تھی اس کی وجہ یہ ہے
کہ لفظ انشائیہ کوئی خارج از زبان نہ تھا اور نہ ہی یہ کسی اور زبان سے
مستعار لے کر اردو میں متعارف کرایا گیا تھا۔"[۱۷]

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انشائیہ کا لفظ وزیر آغا کے استعمال سے قبل بھی موجود تھا بلکہ مختلف نوع کے مضامین کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں ناقدین نے یہ بھی نشان دہی کی کہ یہ لفظ کس کس نے کہاں، کیسے اور کس ضمن میں استعمال کیا جیسا کہ وزیر آغا سے پہلے محمد حسین آزاد کے مکاتیب کے مجموعے میں انشائیہ کی اصلاح ملتی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس میں انشاء پردازی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے لیکن اختر اورینوی کے ہاں بھی یہ اصطلاح ملتی ہے انہوں نے علی اکبر قاصد کی کتاب "ترنگ" کے مقدمہ میں انشائیہ کو استعمال کیا جو بطور انشائیہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ ان تمام مباحث کو ملحوظ رکھتے ہوئے جہاں ان کو تسلیم کیا گیا ہے وہیں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انشائیہ بطور صنف جن خوبیوں کی بنیاد پر ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانہ جاتا ہے۔ اس کو باقاعدہ طور پر ان معنوں میں وزیر آغا نے نہ صرف متعارف کروایا بلکہ عملی مثالیں بھی پیش کی۔ ڈاکٹر انور جمال پاشا وزیر آغا کی معنویت تسلیم بھی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کہتے ہیں۔

> "انشائیہ کے سلسلے میں قواعد کی کتابوں میں انشائیہ کا لفظ برابر ملتا ہے اور انشائیہ کا لفظ استعمال بھی ہوتا رہا ہے مگر لائٹ ایسے کے لیے انشائیہ کی اصطلاح سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا نے استعمال کی اسے برتا اور اس کے فنی نمونے تخلیق کیے اور اسے ایک صنف ادب اور تحریک کی شکل دی۔"(۱۸)

ڈاکٹر انور سدید نے تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ نہ صرف ڈاکٹر وزیر آغا اولین باقاعدہ انشائیہ نگار ہیں بلکہ اس اصطلاح کو فروغ دینے میں میرزا ادیب نے اہم کردار ادا کیا اور رسالہ "ادب لطیف" میں اس اصطلاح کو فروغ دینے کے اقدامات کیے اس سلسلے میں انور سدید لکھتے ہیں:

> "اس اصطلاح کو عوامی قبولیت میرزا ادیب نے دی جنہوں نے "ادب لطیف" میں ڈاکٹر وزیر آغا کے متعدد انشائیے شائع کئے اور یوں نہ صرف انشائیہ کا لفظ لوگوں کے دلوں میں اتار دیا بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی کہ اس صنف کا آغاز ادب لطیف نے کیا اور اس کے اولین باقاعدہ انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی

ضروری ہے کہ وزیر آغا نے اپنے آپ کو اس صنف کا بانی کبھی شمار نہیں کیا۔"(۱۹)

اس بات کی تردید ڈاکٹر وزیر آغا نے خود بھی کی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ کیسے انہوں نے اور میرزا ادیب نے لفظ "انشائیہ "جو کہ اس سے پہلے وزیر آغا نے کسی رسالے میں پڑھا تھا اس کو اصطلاح کے لیے استعمال کیا۔ ویسے بھی اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ کوئی لفظ فردی حیثیت اور قواعد و انشا میں کہیں نا کہیں موجود ہوتا ہے جس کو استعمال میں لا کر اصطلاحی طور پر ایک خاص مفہوم کا پہناوا پہنایا جا سکتا۔ ادب میں ہمیشہ مانوس اور موضوع الفاظ کا استعمال ہی کیا جاتا ہے نہ کے غیر مانوس اور متروک الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ اس بات کو مد نظر رکھا جائے تو اس بات میں کسی قسم کی تشویش نہیں کے انشائیہ کا لفظ غیر مانوس اور نیا ہو۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اردو میں انشائیہ کی کوئی خاص روایت موجود نہیں تھی اور قارئین نے ایسے کو طنزیہ مزاحیہ مضامین سے الگ اور جدا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی اس لیے جب ماہنامہ "ادب لطیف" میں لائٹ ایسے کو پیش کرنے کی تحریک کا آغاز ہوا تو میرے اور میرزا ادیب کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ لائٹ ایسے کو کیا نام دیا جائے تاکہ یہ دوسری اصناف سے الگ نظر آ سکے۔ کچھ عرصہ کے لیے ہم نے "لطیف پارہ" کی ترکیب استعمال کی لیکن یہ مقبول نہ ہو سکی۔ پھر ہم نے " انشائے لطیف" کی ترغیب کا احیا کیا۔۔۔ اسے بھی ترک کرنا پڑا۔ اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا۔ میرزا ادیب صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے بعد ادب لطیف میں لائٹ ایسے کے لیے انشائیہ کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا اور خوش قسمتی سے یہ مقبول بھی ہو گیا۔"(۲۰)

ناقدین نے جہاں وزیر آغا کی اولیت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ نشاندہی کی کہ ادب میں انشائیہ کی اصطلاح وزیر آغا سے پہلے بھی موجود تھی اور انہی معنی میں استعمال ہو رہی تھی تو وہیں اس بات کی وضاحت بھی ہمیں مل جاتی ہے کہ جن معنی میں اور جس مخصوص قسم کی خصوصیات کی حامل تحریر کو وزیر آغا نے بطور صنف انشائیہ استعمال کیا اور فروغ دیا ان سے قبل اس طرف کسی نے خاص توجہ نہ کی تھی۔ لہذا یہ کہنا غیر نہ ہو گا کہ انشائیے کا یہ لفظ جو کہ مختلف مضامین اور تحریریوں کے لیے بھی استعمال میں تھا اس کو باقاعدہ بطور صنف کا درجہ اس کی خصوصیات اجاگر کرتے ہوئے وزیر آغا کی دین ہے۔ اس لیے انشائیے کی صنف متعارف کرانے میں جو قابل ذکر خدمات وزیر آغا نے انجام دی ان کے بعد وزیر آغا کو انشائیے جیسی لطیف صنف کی ابتدا کے ساتھ جوڑنا نہایت ضروری ہے اگر وزیر آغا کی قابل قدر خدمات نہ ہوتی تو انشائیہ جو آج ترقی کی منازل طے کر رہا اس سے ادب محروم رہ جاتا چنانچہ وزیر آغا کا نام اور انشائیہ ساتھ ساتھ ہے اس صنف کو وقت کے ساتھ ساتھ جتنی ترقی ملتی جائے گی اس میں کسی طور وزیر آغا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انشائیہ ایک خاص طرز کے لکھے گئے مضمون کو کہتے ہیں جو اپنے خاص اسلوب کی بدولت مضمون سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ اور اس کا رجحان "ادب لطیف" سے ہوا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اردو ادب میں انشائیہ جس کے لیے انگریزی میں Essay کے معنی ملتے ہیں۔ یہ در حقیقت اصطلاح میں یہ مفہوم نہیں رکھتا کیونکہ "Essay" اردو میں مضمون کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ مضمون اور انشائیہ اردو ادب میں الگ الگ صنف کے طور پہچانی جاتی ہیں۔ انگریزی میں جس تحریر کو انشائیہ کا درجہ حاصل ہے اس کے لیے انگریزی میں Personal Essay or Light Essay کی اصطلاح رائج ہے۔ یعنی انگریزی میں Personal Essay ہی در اصل اردو میں انشائیہ کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر سیفی اس ضمن میں کہتے ہیں۔

> "چونکہ اردو میں ایسے کی متبادل اصطلاح مضمون موجود ہے اور اتنی ہی وسیع ہے جتنی انگریزی ایسے اصطلاح اس لیے مناسب یہی ہے کہ انشائیہ کو پرسنل ایسے کے مترادف ہی رہنے دیا جائے اسے سارے ایسے پر محیط کرنے کی شفارش نہ کی جائے۔"(۲۱)

اس ضمن میں پروفیسر جمیل آذر کی رائے بھی اہمیت کی حامل ہے۔

"انشائیہ انگریزی کے ان مضامین کا مرہون منت ہے جو Personal Essay کہلاتے ہیں۔"(۲۲)

ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی انشائیہ کے لیے پرسنل ایسے (Personal Essay) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔اس بات کی تائید کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں:

"انشائیے کے اولین نقاد ڈاکٹر وزیر آغا انشائیے کو انگریزی Essay کی اس نوع سے عبارت کرتے ہیں جسے Personal Essay کا عنوان دیا جاتا ہے۔"(۲۳)

دی والڈ انسائیکوپیڈیا میں Personal Essay اور Formal Essay دونوں کی وضاحت میں لکھا ہے۔

"Personal Essay were originated by ""Michel de Montaigne a French writes of 1500's. He was first writer to establish the essay as a distinct form of literature. The word essay comes from Essais (1580), Montaigne's Two volume collection of writing. Montaigne's called this collection of writing Montaigne's called this collection Essais,a French word meaning trials or attempts because his compositions are Exploratory and informal. They are based mainly on personal experience and

discuss such topics as idleness, Judgement and lying".[۲۴]

انشایئے کی ہیت موضوع اور فنی محاسن پر مباحث مختلف انشائی مجموعوں مضامین، ادبی و تنقیدی کتب دیباچوں اور ادبی رسالوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان مضامین کے بغور مطالعے سے جہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ محققین کی آرا میں اختلافات پائے جاتے ہیں جس کی بنا پر اس کی کوئی ایک باقاعدہ تعریف نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محققین مصنفین اور ناقدین انشایئے کے حوالے سے چند نکات پر متفق نظر آتے ہیں جس کی بدولت انشایئے کی ایسی تعریفیں وجود میں آتی ہیں جن سے انشایئے کی خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں۔

بعض ناقدین ایسے بھی ہیں جو انشایئے کو مضمون ہی کہتے ہیں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ لیکن تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں بحیثیت الگ صنف کے شناخت رکھتی ہیں۔ جو چند مشترک خصوصیات کی بنا پر پہچانی نہیں جاسکتی۔ گو کے یہاں مقصد محققین کے اختلافات اور اعتراضات بیان کرنا نہیں۔ لہذا ان اختلافات کے باوجود جن بنیادوں پر محققین متفق نظر آتے ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے انشایئے کے فن کی خصوصیات کو ذیل میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے خدوخال میں انشایئے کی تعریف کرتے ہوئے اس کی خصوصیات اس طرح سے اجاگر کرتے ہیں:

"انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"[۲۵]

وزیر آغا نے یہ وضاحت پیش کرتے ہوئے کے کسی بھی صنف کی حتمی تعریف ممکن نہیں ہر صنف اپنے مزاج کے اعتبار سے وسیع میدان رکھتی ہے جس کی تعریف چند الفاظ اور جملوں میں کرنا ممکن نہیں۔ لیکن جیسا کہ تحقیق سے ثابت ہوا کہ ڈاکٹر وزیر نے اس صنف کے لیے انشایئے کی اصطلاح رائج کی، اسی لیے

اس ضمن میں وزیر آغا کی بیان کردہ تعریف کو اولیت کا درجہ دیتے ہوئے پر کھا گیا ہے۔ اس تعریف میں ہمیں تین بنیادی نکات ملتے ہیں جو انشائیے کی خصوصیات کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تعریف سے جو پہلی خصوصیت سامنے آتی ہے وہ انشائیے کے اسلوب سے متعلق ہے۔ انشائیہ کا اسلوب تازہ ہونا چاہیے۔ دوسرے نمبر پر انشائیے میں موضوع کو خاص اہمیت دی گئی ہے اس میں عام شے کو ایسے بیان کرنا کہ اس کی ایسی خوبی اجاگر ہو جائے جو عام طور پر نظروں سے او جھل رہتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی اس تعریف کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ انشائیہ میں نئے جہان معنی آباد کیے جاتے ہیں اس سے ایک نیا مفہوم واضح ہوتا ہے جس کے بعد قاری ایک نئی ذہنی وسعت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے یا یوں کہہ لیں کے پہچان کرواتے ہوئے درج ذیل نکات سامنے لائے ہیں۔ غیر رسمی طریقہ کار، شخصی رد عمل، عدم تکمیل، ڈھانچے کا لچیلا پن، اختصار، موضوع اور نقطہ نظر کا انوکھا پن، اسلوب کی تازگی۔ یہ وہ تمام نکات ہیں جو ایک مکمل انشائیے کی پہچان ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے بیان کے مطابق وزیر آغا کہ خود کے انشائیے ان اصولوں پر پورا نہیں اترتے۔ ڈاکٹر سلیم اختر انشائیے کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "بیدار ذہن کی حامل تخلیقی شخصیت کی زندگی کے تنوع سے زندہ دلچسپی کے بامزا نثر میں مختصر اور لطیف اظہار کو انشائیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"(۲۶)

ڈاکٹر سلیم اختر انشائیے کے روکھے پھیکے اسلوب کے خلاف ہیں اور انشائیے کی تعریفیں جو انشائیہ نگاروں نے متعین کی ان کے بھی خلاف ہیں۔ ان کی کی گئی اس تعریف کے مطابق انشائیہ تخلیقی صلاحیت کی پیدا کردہ ہے یعنی ڈاکٹر سلیم اختر بھی انشائیہ میں ایسی خوبی تلاش کرتے دیکھائی دیتے ہیں جو عام ذہن سے ہٹ کر ہو اس میں ایک نیا پن ہو۔ مختصر اور جامع تحریر لطیف پرائے میں ہو۔ اس تعریف کہ ذریعے ڈاکٹر سلیم اختر نے یہ بھی واضح کر دیا کہ جو عام طور پر انشائیے کے زاویہ نگاہ، اختصار، حسن بیان اور اسلوب پر زور دیا جاتا وہ بھی انشائیے کی خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے انشائیے کی جو خصوصیات گنوائی ہیں اس میں اختصار، غیر رسمی طریقہ کار، اسلوب کی شگفتگی، عدم تکمیل کا احساس، شخصی نقطہ نظر، عنوانات کا موضوع یا نقطہ نظر شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل آذر انشائیہ اور انفرادی سوچ میں انشائیے کی خصوصیات اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انشائیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جیسے ہی شروع ہو قاری کو محسوس ہونے لگے کہ کسی نے ستار کے تاروں پر مضراب رکھ دی ہے۔ ستار بجتا ہے اور سامع اس کی لہروں میں گم ہو جاتا ہے۔ پر کشش لہریں کانوں کے رستے دل اور دماغ پر چھا جاتی ہیں۔۔۔ یہ ایک نثر پارہ ہے جو اپنی طوالت کے اعتبار سے آدھ صفحہ سے لے کر بیس یا زیادہ پچیس صفحات پر پھیلا ہوتا ہے۔۔۔ زندگی کے کسی بھی گوشے کو بطور موضوع پیش کیا جا سکتا ہے۔۔۔ انشائیہ میں موضوعیت (Subjectivity) ایسے ہی ضروری ہے جیسے شعر میں وزن اور آہنگ یہیں سے انشائیہ میں مصنف کی اپنی ذات شامل ہوتی ہے۔۔۔ انشائیہ میں شخصی اور غیر شخصی پہلوؤں کی آویزش (Criss – cross) ہی نہیں بلکہ انضمام (Blending) بھی ہوتا ہے۔ تاہم اس میں فلسفیانہ غور و فکر کا بوجھل پن نہیں ہونا چاہیے۔"(۲۷)

پروفیسر جمیل آذر نے بھی انشائیے کی امتیازی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے۔ انہی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن کی طرف ڈاکٹر وزیر آغا اور سلیم اختر بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے انشائیے میں معروضیت یعنی اختصار کو سب سے زیادہ اہمت کا حامل قرار دیا ہے۔ اس کی اہم خوبی اس کا جامع ہونا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار اپنی زندگی کے کسی بھی پہلو یا کسی بھی گوشے کو موضوع بنا کر اپنی ذات کے حوالے سے لکھتا ہے۔ اس حوالے سے جمیل آذر کی رائے ہے کہ مصنف کی ذات کا گوشہ انتہائی معروضی ہو فلسفیانہ غور فکر اور بوجھل پن نہ ہو۔ اسلوب سادہ اور نکھرا ہوا ہو۔

پروفیسر انور جمال کے مطابق انشائیہ میں ذات کا حوالہ سب سے اہم ہے۔ انہوں نے اس صنف کی خصوصیات کے بارے لکھا ہے:

"انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں دانش مندانہ شگفتگی اور متنوع انداز اختیار کر کے زندگی کے معمولی واقعات و متعلقات سے لے

کر اہم اور خصوصی حوالوں تک گفتگو کی جائے اور مانوس اشیاء کے نا مانوس پہلو تلاش کیے جائیں۔ انشائیے میں ذات کا حوالہ اہم ہے۔"(۲۸)

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مانوس اشیا کے نامانوس پہلوؤں کو اپنی ذات کے حوالے سے شگفتہ اور متنوع انداز میں پیش کرنا انشائیہ کہلاتا ہے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں "آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ کے دیباچہ میں انشائیے کی بحیثیت صنف بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انشائیہ نثری اظہار کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار، شخصی رد عمل، عدم تکمیل، رمزیت و اشاریت، غیر منطقی ربط، اختصار، دعوت فکر، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت و زبان و بیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔"(۲۹)

ڈاکٹر سید معصوم رضا اپنی تحقیقی اور تنقیدی کتاب "اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا" میں انشائیہ کو شخصی تصنیف اور مصنف کی ذہنی اختراع کا نام دیتے ہوئے انشائیے کی درجہ ذیل خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

"اس کی ہیت اور تکنیک یا کسی شکل و صورت کا تعین ممکن نہیں پھر بھی درج ذیل خصوصیات کا ہونا انشائیہ کے لیے اہم ہے۔(۱)غیر رسمی طریقہ کار یا بے ربطی (۲) غیر سالمیت یا عدم تکمیل (۳)انکشاف ذات (۴)مسرت آفرینی (۵)موضوع کا تنوع (۶)زبان و بیان میں بانکپن و اختصار (۷)بے بات سے بات پیدا کرنا(۸) شخصی رد عمل اور (۹)دعوت فکر وغیرہ۔"(۳۰)

ان ناقدین اور مصنفین کی تعریفوں اور انشائیہ کی خصوصیات کا تفصلی مطالعہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ انشائیہ اب ایک باقاعدہ صنف ہے جو ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ انشائیہ کیا ہے اس حوالے سے مباحث انشائیہ کا معیار مقرر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

فن انشائیہ نگاری کی خصوصیات اور اصول جو کے وضع ہو چکے ہیں۔ جن میں سب سے اہم اور بنیادی وصف انشائیہ کا جامع ہونا یعنی انشائیے میں اختصار کا مظاہرہ کرنا ہے۔ انشائیے کی وہ خصوصیت جو اس کو دیگر اصناف ادب سے مختلف بناتی ہے یا جس کو ہم انشائیے کی پہچان کہہ سکتے ہیں وہ اس صنف میں فرد کا شخصی رد عمل ہے۔ جس کو عام طور پر انکشاف ذات کا نام دیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں چونکہ مصنف اپنی ذات کے حوالے سے بات کرتا ہے جس کی پابندی کسی دوسری صنف کے لیے ضروری نہیں لہذا ذاتی بیان انشائیے کی خصوصیات میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انشائیے کا انداز غیر رسمی اور بے باک ہے۔ یہ صنف خود میں متنوع موضوعات سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس میں موضوعات کی رنگارنگی دیکھی جاسکتی ہے۔ انشائیہ نگارانشائیے میں ایک عام خیال کو عام ذہنی سطح کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ اس سب کے اظہار اور بیان کے لیے سادہ عام فہم زبان مزاح کی ہلکی پھلکی چاشنی لیے ہوئے کرتا ہے۔ اس کے ذریعے عام ذہن کو ایک نئی سوچ دی جاسکتی ہے یوں کہہ لیجیے انشائیہ ڈوبتے کو سہارا دینے کا کام کرتا ہے۔ یہ سہارا اس طرح کہ جب قاری زندگی کے کسی شعبہ سے دل برداشتہ ہو کر سب امیدیں ختم کر چکا ہوتا ہے تب انشائیہ اس شخص کو ایک نئی سوچ اور نیا خیال مہیا کرتا ہے جس کے بارے میں قاری نے اپنی زندگی میں انشائیہ پڑھنے سے قبل توجہ نہیں کی ہوتی۔ انشائیے کے لیے اسلوب کی تازگی اور شگفتگی اہم عناصر ہیں۔

د۔ اردو میں انشائیہ نگاری (پس منظری مطالعہ)

اردو میں انشائیہ نگاری کا پس منظری مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اردو میں انشائیہ دیگر ادبی اصناف (ناول، افسانہ، تنقید ی وغیرہ) کی طرح یہ صنف بھی مغرب کی دین ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ زیر بحث رہا کہ انشائیہ فرانسیسی Essai اور انگریزی کے Personal Essay\Light Essay کے مترادف ہے۔ اردو میں انشائیہ کو بطور صنف ادب ڈاکٹر وزیر آغا نے متعارف کروایا۔ اور اس صنف کے پیش نظر عملی نمونے پیش کیے۔ جب کہ ان سے قبل سر سید تحریک کے تحت مضمون نگاری کا رواج عام تھا جن میں سے اکثر مضامین کو انگریزی کے پرسنل ایسے سے متاثر ہو کر نہ صرف لکھا گیا بلکہ تراجم بھی کیے گئے لیکن اردو میں باقاعدہ انشائیہ کو اس کی خصوصیات سمیت وزیر آغا نے متعارف کروانے میں اہم تحریک دی۔ اسی لیے اردو انشائیے میں اولیت کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ نے اپنی کتاب "انشائیہ پچیسی" میں ملاوجہی کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار کے طور پر ان کی سب رس کو انشائیے کے اصولوں کے ضمن میں پرکھا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ انشائیہ خالص اردو صنف ادب ہے اور انگریزی میں جس دور میں مونتین جو انگریزی انشائیہ کا باوا آدم ہے نے فرانسیسی انشائیے سے متاثر ہو کر انشائیے لکھے اسی دور میں ملاوجہی نے "سب رس" لکھی جو کسی سے بھی متاثر ہو کر نہیں لکھی گئی۔ لہٰذا انہوں نے ملاوجہی کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "دور سر سید میں انگریزی ادب سے ہمارے انشائیہ نے ضرور استفادہ کیا مگر یہ کہنا غلط ہے کہ اردو انشائیہ انگریزی سے آیا۔ ہمارا انشائیہ کلیتاً ہمارا اپنا انشائیہ ہے۔ ملاوجہی اردو انشائیے کا باوا آدم ہے جس وقت عالمی ادب میں انشائیے کی صنف نے جنم لیا کم و بیش اسی وقت ہمارا انشائیہ بھی عالم وجود میں آیا۔"[۳۱]

ملاوجہی کے بعد محمد حسین آزاد کے مضامین جو انگریزی انشائیوں کا ترجمہ "نیرنگ خیال" کی صورت میں ہے۔ ان کو بھی کچھ ناقدین نے اردو انشائیے کی پہلی باضابطہ کتاب قرار دیا ہے۔ لیکن وزیر آغا اور

نظیر صدیقی سے پہلے کی تحریریں یا مضامین جن کو تنقید نگاروں نے انشایئے کے ضمن میں پرکھا ہے ان کا جائزہ لیتے ہوئے قدیر زماں کا موقف دیکھئے جس کے بعد مزید وضاحتوں کی گنجائش نہیں رہتی۔

> "ملاّ وجہی کی "سب رس" کو انشائیہ کہا جاتا ہے۔ اختلاف کی گنجائش کم ہے لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم کسی افسانے یا ناول کو انشائیہ کا نام نہیں دیں گے۔ اس میں انشائیوں کی کثرت ہو سکتی ہے۔ کسی دوسرے موضوعات پر لکھی ہوئی تحریروں میں بھی بہ کثرت انشائیہ کا اسلوب پایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ خواجہ حسن ثانی نظامی کی تالیف "صوفی سلسلے" میں موجود ہے... مگر اس سے مراد یہ نہیں کہ زبان و بیان کی چند خوبیوں کے استعمال سے تحریر انشائیہ کہلائے گی۔ اس کا باقاعدہ ایک اپنا خاص اسلوب ہے۔"(۳۲)

مختصر یہ کہ اگر اردو ادب میں انشایئے کے ابتدائی نقوش پر بات کی جائے تو ہمیں انشایئے کے نمونے قدیم سے ہی ملتے ہیں اردو ادب کی پہلی نثری داستان ملا وجہی کی سب رس میں ناقدین نے اس کے کچھ حصوں میں انشایئے کے نقوش بتائے ہیں جن کو انشائیہ نگاری کے ضمن میں پرکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر وزیر آغا سے قبل انشائیہ نگاری کا منظر نامہ دیکھیں تو انیسویں صدی میں مضمون نگاری جو کہ انشایئے سے قریب تر ہے اس کو سر سید اور ان کے رفقاء کے طفیل اردو ادب میں فروغ ملا۔ سر سید تحریک کے زیر اثر بہت سی ایسی اصناف کو فروغ حاصل ہوا جو مغرب سے حاصل کردہ تھیں۔ سر سید نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں باقاعدہ انگریزی مضامین کی پیروی کرتے ہوئے انگریزی Essay کے انداز میں مضامین لکھنے شروع کیے کیوں کے یہ مضامین انگریزی ادب سے متاثر ہو کر لکھے جا رہے تھے اس لیے ان کے مضامین میں چند ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو انشایئے کے نمونے کہلاتے ہیں۔ سر سید کے رفقاء میں سے مولانا حسین آزاد کے مضامین کا مجموعہ "نیرنگ خیال" میں بھی چند مضامین انشایئے کی خصوصیات لیے ہوئے ہیں۔ جس کی بڑی وجہ انگریزی مصنفین کے پرسنل ایسے کا ترجمہ ہے۔ جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح ان مضامین کی پیروی کرتے ہوئے اردو ادب میں دیگر مصنفین نے بھی طبع آزمائی کی جن میں انشایئے کے نقش پائے جاتے ہیں چونکہ یہ مضامین جو

انشائیے کے اصولوں پر بھی پورا اترتے ہیں اس لیے ان کو ابتدائی انشائیے کی صنف کی فہرست میں تور کھا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی خیال رہے کے یہ شعوری کوشش انشائیے کے تحت نہیں لکھے گئے بلکہ مضمون نگاری کے ضمن میں لکھے جا رہے تھے۔اس لیے ان مضامین کو ہم انشائیے کا باقاعدہ آغاز نہیں کہہ سکتے۔انشائیے کی خصوصیات ان تحریروں میں محض اتفاقی ہیں۔

انشائیے کی باقاعدہ ابتدا محققین نے قیام پاکستان کے بعد بتاتے ہوئے اسے خالص پاکستانی صنف قرار دیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا اپنے ایک مضمون انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری میں لکھتے ہیں:

> "تقسیم کے فوراً بعد (بالخصوص پاکستان میں)انشائیہ نویسی کا رجحان اپنے واضح خدوخال کے ساتھ نمودار ہوا اس زمانے میں نصیر آغا، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی اور امجد حسین کے ایسے مضامین سامنے آئے۔ جن میں سے بعض انشائیے کے اولین نمونے تھے گو ان ادبا کو علم نہیں تھا کہ وہ صنف انشائیہ میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ اپنی ترنگ میں اشیاء تجربات اور تعقلات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ مگر اس نتیجے میں ان کے ہاں جو تحریریں جنم لے رہی تھی وہ مغرب کی مقبول صنف ادب یعنی "لائٹ ایسے" یا انشائیہ کے زمرے میں شامل تھیں۔"(۳۳)

اردو میں انشائیہ نگاری کے ضمن میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہ صنف نثر اردو میں خاصی نئی ہے۔۱۹۴۷ یعنی قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں اس صنف کو رواج ملا اور اس سے قبل جو انشائیے کی صورتیں ملتی ہیں وہ انگریزی مصنفین کے مضامین کے مطالعہ اور تراجم کے باعث محض اتفاق ہے۔اس صنف کو باقاعدہ ادب کی صورت دینے اور بلند مقام تک پہنچانے میں وزیر آغا نے اہم خدمات سرانجام دیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے خاص اہمیت کی حامل ہے وہ لکھتے ہیں:

> "انشائیہ اپنی فعال حیثیت میں ۱۹۲۱ کے لگ بھگ اس وقت سامنے آیا جب میرزا ادیب اور وزیر آغا نے اس کے قبول عام کی راہ ہموار کر دی انشائیوں کی پہلی کتاب "خیال پارے "(وزیر آغا)اسی سال شائع ہوئی تو اسے وہی اہمیت ملی جو ترقی پسند تحریک میں افسانوں کی کتاب "انگارے "کو ملی تھی۔"(۳۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کو اردو کا پہلا باضابطہ انشائیہ نگار مانا جاتا ہے۔انہی کی کوششوں کی بدولت اردو میں انشائیہ نگاری کو فروغ ملا۔انہوں نے ایک واضح تصور اور خیال کہ ساتھ انشایئے تحریر کیے۔گو کہ ناقدین ان کے انشائیوں کو مکمل انشائیوں کے اصولوں کے مطابق سمجھیں یانہ سمجھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے واضح انشائی خیال کے تحت انشایئے لکھے۔وزیر آغا کے انشائی مجموعوں میں خیال پارے(۱۹۶۱)چوری سے یاری تک (۱۹۶۶)دوسرا کنارہ (۱۹۸۲) سمندر اگر میرے اندر گرے(۱۹۸۹) شامل ہیں۔"پگڈنڈی" (۲۰۱۰) وزیر آغا کے انشائیوں کا کلیات ہے۔اس صنف کو فروغ بخشنے اور اس کے خدوخال واضح کرنے کے لیے وزیر آغا نے کئی مضامین بھی تحریر کیے۔اس سلسلے میں ان کی کتاب انشائیہ کے خدوخال اہمیت کی حامل ہے۔ڈاکٹر بشیر سیفی کہتے ہیں:

> "اردو کے جدید انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام مستقل اہمیت رکھتا ہے ۔انہوں نے اردو میں باقاعدہ انشائیہ نگاری کا آغاز کرنے ،انشائیہ نگاری کو ایک تحریک بنانے اور اس صنف کے خدوخال واضح کرنے کے سلسلے میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان کے پیش نظر بعض لوگوں نے انہیں اردو کا پہلا انشائیہ نگار بھی کہا ہے۔"(۳۵)

لیکن اس صنف میں ابتدائی طور پر طبع آزمائی کے ضمن میں ہمارے سامنے تین نام آتے ہیں۔وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "خیال پارے جولائی ۱۹۶۱ میں منظر عام پر آیا۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کے جہاں ایک طرف اردو انشائیہ نگاری کا بادشاہ وزیر آغا ہیں وہیں دوسری طرف ان کے انشائی مجموعہ سے دوماہ قبل نظیر صدیقی کی کتاب "شہرت کی خاطر "اپریل ۱۹۶۱ میں منظر عام پر آئی۔انہوں نے اس کتاب کے دیباچے میں

کسی حد تک انشائیے کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش بھی کی۔ جو ان کے انگریزی پرسنل ایسے سے رغبت کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح اس ضمن میں مشکور حسین یاد کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے ان کے مضامین کی کتاب پر بات کی جائے تو یہ "جوہر اندیشہ" کے نام سے ۱۹۷۵ میں منظر عام پر آئی لیکن اس سے قبل مشکور حسین یاد کے مضامین ۱۹۵۴ میں مختلف ادبی رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں۔ مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی کا نام اس اولیت کے لحاظ سے اہمیت کا حامل تو ہے لیکن انہوں نے اس کو اس سنجیدگی سے نہیں لیا جس سنجیدگی سے ان کے ہم عصر اردو انشائیہ نگاری کے بانی ڈاکٹر وزیر آغا نے لیا۔ ڈاکٹر رخشندہ مراد اس بات کی تائید کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> "ان دونوں نامور ادباء نے انشائیہ نگاری کو اس سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا جس طرح وزیر آغا نے نہ صرف انشائیے کو بطور صنف ادب عام طنز و مزاحیہ مضامین سے الگ حیثیت دی بلکہ اس پر متعدد تنقیدی مضامین لکھ کر اس صنف کو پاکستان میں بھرپور انداز میں تحریک کے طور پر متعارف کرایا اور انشائیہ نگاری کو مقبولیت سے ہم کنار کرنے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔"(۳۶)

ہر صنف ارتقائی مراحل میں بعض خامیوں اور ابتدائی کاوشوں کے زمرے میں پرکھی جاتی ہیں۔ اگر ہم انشائیے کو اس کے ارتقائی مراحل مد نظر رکھتے ہوئے مختلف ادوار میں تقسیم کریں تو انشائیے کے ابتدائی دور میں وزیر آغا، نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد اس صنف میں طبع آزمائی کرنے والوں کو انشائیہ نگاری کے دوسرے دور کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے سائرہ بتول نے اپنے مقالے میں انشائیہ نگاروں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور دوسرے دور کے اہم انشائیہ نگاروں میں مشتاق قمر کا نام سرفہرست ہے۔ "ہم ہیں مشتاق" کہ نام سے ۱۹۷۰ میں شائع ہونے والا ان کا اہم اانشائی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل مشتاق قمر "اوراق" میں تسلسل کے ساتھ انشائیے لکھتے رہے۔ ان کے بعد جمیل آذر کا نام اس صف میں اہمیت کا حامل۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے انشائی مجموعوں میں "شاخ زیتون"، "رت کے مہمان" اور "وقت اے وقت" اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے ساتھ

ساتھ انہوں نے انشائیوں پر تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے اس حوالے سے ان کی کتاب "انشائیہ اور انفرادی سوچ" اہمیت کی حامل ہے۔ اسی دور کے اہم انشائیوں نگاروں میں غلام جیلانی اصغر ہیں ان کے انشائیے بھی "اوراق" میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا انشائیوں کا مجموعہ "نرم دم گفتگو" ۱۹۹۶ میں شائع ہوا۔ اکبر حمیدی، سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر انور سدید، انجم نیازی اور حامد برگی دوسرے دور کے انشائیہ نگاروں میں شامل ہیں۔

ان کے بعد جو انشائیہ نگاری کا دور شروع ہوتا ہے اس کے اہم لکھنے والوں میں ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی، حیدر قریشی، خیر الدین انصاری، پروین طارق، ناصر عباس نیر، اے۔ غفار پاشا، شہزاد قیصر، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، شفیع ہمدم، حنیف باوا، خالد اقبال، منور عثمانی، صلاحالدین حیدر، ارشد میر، تقی حسین خسرو، حسرت کاسگنجوی، سلمان بٹ، بشیر سیفی، جان کاشمیری، محمد یونس بٹ، امجد طفیل وغیرہ ایسے نام ہیں جنہوں نے انشائیے کو ایک بڑے مقام تک پہنچایا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر روش ندیم کی تحقیق خاص اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون انشائیہ نگاری: شناخت اور اردو روایت و تسلسل میں اردو انشائیے کے سر فہرست انشائیہ نگاروں کی ذیل میں ناقدین کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ:

> "اور انہوں نے (ڈاکٹر وزیر آغا نے) ہی میرزا ادیب کی معاونت سے لفظ انشائیہ کو لائٹ ایسے کے لیے استعمال کرنے کا آغاز کیا یوں اردو انشائیہ نگاروں کی پہلی کھیپ مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، جمیل آذر اور غلام جیلانی اصغر اور دوسری کھیپ متزکرہ سمیت انور سدید، کامل القادری، تقی حسین خسرو، احمد جمال پاشا، شہزاد احمد، اکبر حمیدی، سلیم آغا قزلباش اور ارشد میر کی صورتوں میں پروان چڑھی اور انشائیہ نگاری باقاعدہ طور پر اردو ادب کا حصہ بن گئی۔" [۳۷]

اردو انشائیہ نگاری کے آغاز میں ہی اردو انشائیے کو ایسے قابل انشائیہ نگار ملے کہ یہ صنف اتنے کم عرصے میں بھی اتنی بڑھتی پھلتی پھولتی گئی۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو لکھتی ہیں۔

"پاکستان میں اردو انشائیہ آج اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ رخشندہ ستارے کی طرح اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔ حالانکہ اسے وہاں کے ادب میں اپنا مقام بنائے ہوئے صرف چالس برس کا ہی مختصر عرصہ گزرا ہے لیکن اس کم عرصے میں ہی وہاں کے دور اندیش انشائیہ نگاروں نے اردو ادب کو ایسے نادر موتیوں سے نوازا ہے جنہیں ہم مغرب کے بہترین انشائیوں کی صف میں کھڑا کر کے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی بہترین انشاء پردازی کا وصف رکھتے ہیں۔"[۳۸]

اس مختصر پس منظری مطالعہ کے بعد یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ کے حوالے سے تین قسم کے گرہو ملتے ہیں ایک وہ جو ملا وجہی کے عہد سے اردو انشائیے کی ابتدا بتاتے ہیں دوسرے وہ جو سرسید عہد میں سرسید اور اس کے رفقاکار کے طفیل اردو انشائیے کی ابتدا بتاتے ہیں تیسرا گرہو وزیر آغا کو اردو کا پہلا باقاعدہ انشائیہ نگار مانتے ہیں۔ لیکن ان سب کا اگر مجموعی جائزہ لیا جائے تو اردو انشائیہ کی تاریخ ان تضادات کے باوجود بھی ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اردو انشائیے کے فروغ میں پاکستان کی طرف سے خدمات پیش پیش ہیں اور پاکستانی ادیبوں نے اس صنف ادب کے تحت قیمتی تخلیقات کے ذریعے ملک و قوم کی ترقی کے لیے بہترین خدمات سر انجام دیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر سے مقالہ نگار کا انٹرویو، بذریعہ ٹیلی فون، ۱۳اگست ۲۰۱۸ء، بروز جمعہ

۲۔ایضاً

۳۔سکندر حیات میکن، ڈاکٹر، میرے استاد، (خاکہ) مطبوعہ: چہار سُو، جلد ۲۶، شمارہ، مارچ، اپریل ۲۰۱۷ء، ص ۴

۴۔ایضاً، ص ۴۹

۵۔محمد انعام الحق، ثنائے قلم، (تعارف) چہار سُو، ایضاً، ص ۷

۶۔نجیب رامپوری، نئی اردو لغت (جامع)، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ، طبع اول، ۲۰۰۴ء، ص ۵۹

۷۔فیروز الدین، مولوی الحاج، (مرتب) فیروز اللغات اردو، (جامع) فیروز سنز لمیٹڈ (پرائیویٹ)، بار اول، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۰

۸۔اطہر حسین صدیقی، حسن اللغات اردو (جامع) اعتقاد پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۲۰

۹۔محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع دوم، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷

۱۰۔وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۳

۱۱۔شان الحق حقی، (مرتبہ)، فرہنگ تلفظ (نستعلیق ایڈیشن) ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۷ء، ص ۷۰

۱۲۔وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع) نظر ثانی محمد حسن خان، علمی کتاب خانہ لاہور، س ن، ص ۱۴۱

۱۳۔کلیم الدین احمد، پروفیسر، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، س ن، ص ۷۸

۱۴۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، (مرتب) کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ، ۱۹۸۵ء، ص۱۸

۱۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۰۸ء، ص۵۶۴

۱۶۔رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر، پروفیسر ،اصناف ادب،سنگ میل پبلکشنز،لاہور،۱۹۷۶ء، ص۷۶

۱۷۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،انشائیہ کی بنیاد،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۶ء، ص۱۵۳

۱۸۔احمد جمال پاشا،انشائیہ کی اصلاح،دہلی کتاب نما،نومبر،۱۹۸۳ء، ص۶۰

۱۹۔انور سدید،ڈاکٹر،انشائیہ کے مباحث مشمولہ ،انتخاب انشائیہ نمبر(مرتب) ڈاکٹر شفیق احمد ،ڈاکٹر روشن آراءراؤ،کاروان ادب ملتان صدر،۱۹۸۸ء، ص۵۰

۲۰۔وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال، نئی آواز۔جامعۂ نگر۔ نئی دہلی،۱۹۹۱ء، ص۱۸

۲۱۔بشیر سیفی،ڈاکٹر،اردو میں انشائیہ نگاری،نذیر سنز پبلشرز لاہور،۲۰۱۳ء، ص۴۷

۲۲۔ جمیل آذر، پروفیسر ،(مرتب)اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، طبع اول،۱۹۷۶ء، ص۸

۲۳۔انور سدید،ڈاکٹر،(مشمولہ)،اردو میں انشائیہ نگاری،ڈاکٹر بشیر سیفی، ص۳۵

۲۴۔The world broke encyclopedia, A world book Lync1986,4-S-A,P.No.686

۲۵۔وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال، ص۵۰

۲۶۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،انشائیہ کی بنیاد، ص۲۱۰

۲۷۔ جمیل آذر، پروفیسر ،انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز،راولپنڈی، ۲۰۰۴ء، ص۱۸

۲۸۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۴۸

۲۹۔ نصیر احمد خان، پروفیسر، (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳

۳۰۔ معصوم رضا، سید، ڈاکٹر، اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا (۱۹۴۵ء تا ۱۹۹۰ء) نیشنل پرنٹرس، روبی آرٹ پریس، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۸

۳۱۔ جاوید وشِشٹ، ڈاکٹر، انشائیہ پچیسی، سلوحبہ پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵

۳۲۔ قدیر زماں، سوئے انشائیہ اور سوانحیِ انشائیے، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳

۳۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ اور اردو انشائیہ، مشمولہ، انشائیہ کے فنی سروکار، مضامین (مرتب) ڈاکٹر احمد امتیاز، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۲

۳۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۶، ص ۵۸۱

۳۵۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، ص ۲۴۰

۳۶۔ رخشندہ مراد، ڈاکٹر، پاکستان میں غیر افسانوی اردو نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ، غیر مطبوعہ، مقالہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۸

۳۷۔ روش ندیم، ڈاکٹر، انشائیہ نگاری: شناخت اور اردو روایت و تسلسل، مشمولہ،

۳۸۔ ہاجرہ بانو، ڈاکٹر، اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار (ایک تجزیاتی مطالعہ) عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴۷

باب دوم: "چراغ آفریدم" کا موضوعاتی مطالعہ

الف۔ سماجی

ب۔ نفسیاتی

ج۔ ادبی

د۔ فلسفیانہ

ہ۔ تصوف

و۔ اخلاقی

حوالہ جات

"چراغ آفریدم" کا موضوعاتی مطالعہ

چراغ آفریدم ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ انشائی مجموعہ اپریل ۲۰۰۰ء میں کاغذی پیرہن، لاہور سے شائع ہوا۔ اس وقت اس میں چوبیس (۲۴) انشائیے شامل تھے۔ اس کے بعد ۲۰۱۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بیکن بکس، ملتان سے دس (۱۰) انشائیوں کے اضافے سے شائع ہوا۔ ان انشائیوں کے عنوانات متنوع موضوعات کا پیش خیمہ ہیں۔

"چراغ آفریدم" کتاب کا عنوان ظاہر کرتا ہے کہ اس میں ناصر عباس نیر نے انسانی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ "چراغ" اردو میں فارسی سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد وہ ظرف ہے جس میں روغن ڈال کر روشنی کے لیے جلایا جاتا ہے۔ جس کو دیا اور شمع وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔ "آفریدم" فارسی کا لفظ ہے جس کا مطلب "میں نے بنایا"، یعنی چراغ روشن کیا۔ ناصر عباس نیر کی اس کتاب کا ذکر کرتے جو بات ذہن میں آتی ہے وہ مشہور شاعر علامہ محمد اقبال کی کتاب "پیام مشرق" میں شامل نظم "محاورہ مابین انسان اور خدا" ہے۔ علامہ اقبال کا مصرعہ ہے۔ "تو شب آفریدی، چراغ آفریدم" جس کا ترجمہ ہے (اے اللہ!) تو نے رات بنائی (یعنی اندھیرا کر دیا) (میں نے تیرے اس اندھیرے کا توڑ) چراغ بنا لیا۔ چراغ آفریدم سے مراد اندھیرے کا توڑ یعنی میں نے چراغ بنایا۔ ناصر عباس نیر نے بنیادی طور پر اس نظم سے ہی فیض (Inspiration) حاصل کیا اور کتاب کا نام چراغ آفریدم رکھا یعنی اس کتاب کے ذریعے قلم کی طاقت سے دنیا میں روشنی پھیلانے کی سعی کی، اس کا اظہار انہوں نے انشائیہ "قلم" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "دنیا میں حق گوئی و بے باکی کا جو بول بالا ہے، وہ سب قلم کے طفیل ہے۔ کیا کوئی ایسا بھی حق گو ہو گزرا ہے جس کے ہاتھ میں قلم نہ ہو یا جس نے قلم کے تخلیق کردہ جہان سے روشنی نہ پائی ہو! اقبال نے بندہ و خدا کے مکالمے میں جو کہا تھا کہ "تو شب آفریدی چراغ آفریدم"... تو یہ چراغ قلم ہی تھا جس کی آفرینش سے انسان خدا کی مانند تخلیق کرنے کے قابل ہوا۔"[1]

"تو شب آفریدی چراغ آفریدم" کا جذبہ ہی ہے جو انسان کے مستقبل کے امکانات کو روشن کرتا ہے اور بے عملی کی بجائے جستجو، تلاش اور تسخیر کے پہلوؤں سے روشناس کرتا ہے یہی جذبہ اس کو اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں انسان کو اسی جذبے کی طرف مائل کیا گیا ہے۔ان کے انشائیوں میں متنوع موضوعات ہیں جو ان کی طبعیت کی عکاسی کرتے ہیں اور انسان کو روشن زندگی گزارنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔مشاہدے کی گہرائی ان کا نمایاں وصف بن کر ابھری ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات میں سماجی، اخلاقی، تصوف، نفسیاتی، فلسفیانہ اور ادبی موضوعات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

الف۔ سماجی

ادب اور سماج کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ادب کا تعلق لازمی طور پر فن کار کی شخصیت سے بھی ہوتا ہے اور فن کار ایک سماج کا حصہ ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طبقے گروہ اور خاندان سے ہوتا ہے۔ادیب سماج کی ایک اکائی ہے جو قلم کی طاقت سے اپنے سماج کی عکاسی کرتا ہے۔جہاں وہ رہتا ہے جن حالات کو دیکھتا ہے وہ بیان کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب کو سماج کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اسی لیے جدید دور میں ادبی تحریروں میں سماجی پہلوؤں کی نشان دہی کی جانے لگی ہے۔جس کو پرکھنے سے وہ حالات مسائل اور سماج کے چھپے گوشے سامنے آتے ہیں جن کی طرف عام قاری کی سوچ نہیں جاتی۔ادب میں سماجیات کا مطالعہ تنقید کے میدان میں ایک نئے علم کے طور پر سامنے آیا۔ادب کو سماجی حوالوں سے پرکھنے کے لیے ماہرین سماجیات نے بھی خدمات سر انجام دیں ہیں۔انیسویں صدی میں گوئٹے اور بیسویں صدی میں ڈرک ہیم کی سماجی مطالعے کے سلسلے میں خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔محمد حسن اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ میں لکھتے ہیں:

> "ماہرین سماجیات نے ۱۹ویں صدی میں گوئٹے اور سپنر کی رہنمائی میں سماج کے مطالعے میں ادب سے کام لینے کی روایت کی بنیاد ڈالی تھی ۲۰ویں صدی میں ڈرک ہیم اور ویبر نے سماج کے مطالعے میں جہاں نئ جہتوں کا اضافہ کیا وہاں ادب کے مطالعے کو بھی نئ اہمیت دی۔"[۲]

بنیادی طور پر سماج سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور انگریزی زبان میں سماج کے لیے Society کا لفظ مروج ہے جبکہ اردو زبان میں سماج کا مترادف معاشرہ ہے جو عربی زبان کا لفظ ہے۔ کیفایت اردو لغت (مروجہ الفاظ، مرکبات، محاورات ضرب الامثال اور سائنس و فنی اصطلاحات کا مجموعہ) میں سماج اور معاشرہ کے معنی اس طرح سے ملتے ہیں:

"سماج (سنسکرت اسم مونث) معاشرہ، سوسائٹی ۲۔ انجمن۔ کمیٹی۔ محفل۔ گروہ جھتا۔ ٹولی۔ منڈلی۔

مُعاشرہَ (مُ۔عا۔ش۔رَہ) (عربی اسم مونث) سماج۔ سوسائٹی۔ جماعتی زندگی۔"(۳)

اصطلاحی معنوں میں سماج سے مراد ایک جگہ اور ماحول میں رہنے سہنے کے ایک جیسے طریقے رسوم، اخلاق و اطوار اور افکار و عقائد وغیرہ کا ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت انسانوں کے گروہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں سماج کی اصطلاح معاشرہ اور Society کے روپ میں ملتی ہے جس کا بیان اس طرح سے کیا گیا ہے:

"سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں۔ معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام بالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول ہمارے اوہام و عقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔ معاشرہ کا لفظ ادبی تحریروں میں سماجی تعلقات کے نظام کے علاوہ کبھی پوری انسانی برادری کے لیے کبھی ایک قوم کے لیے کبھی چند خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔"(۴)

فرد کا سماج کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ فرد واحد کا تنہا وجود کچھ نہیں جب دو افراد مل بیٹھیں تو انہی اکائیوں کے وجود سے گروہ تشکیل پاتا ہے اور اس گروہ کے ایک سے طور طریقے ایک معاشرے کا وجود پیدا

کرتے ہیں جو وسیع پیمانے پر سماج کہلاتا ہے۔یعنی فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں۔ایک ہی جگہ اور معاشرے میں رہنے والے افراد کا زندگی گزارنے کے لیے مل جل کر رہنا آپس میں اچھے تعلقات قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے جو ایک سماج کے لیے معاون ہوتا ہے۔ خلیل صدیقی زبان، سماج اور تہذیب پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہم عموماً سماج سے متعلق اس طرح بات چیت کرتے ہیں جیسے اس کا کوئی معروضی وجود ہو یا اس کی کوئی بنی بنائی ساخت ہو لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سماج، ہر سطح اور ہر نوعیت کی انسانی تنظیم کے افراد کے مابین اتفاق واتحاد، سوجھ، بوجھ اور تعلقات کے تاروپود کا ایک پیچیدہ بناؤ ہے۔یہ تنظیم ایک خاندان سے لے کر قوموں تک بلکہ تمام بنی نوع انسان تک محیط ہو سکتی ہے۔انسانی سماج کے استحکام اور فلاح کا دارومدار اسی اکائی پر ہوتا ہے۔"(۵)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماج میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔اس طرح تحریروں کے سماجی مطالعے سے ہم ہر دور کی سماجی تاریخ باخوبی جان سکتے ہیں کیسے کس دور میں کیا کیا تبدیلی رونما ہوئی کس دور میں کیا کیا سماجی مسائل رہے کیسا مثالی سماج رہا یہ سب ادب کے آئینے میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا۔ناصر عباس نیر نے انشائیوں میں سماج کے کن پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے ذیل میں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

انشائیہ کا براہ راست تعلق انشائیہ نگار کی ذات سے ہوتا ہے اور ذات کا تعلق سماج سے یہی وجہ ہے کہ ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں سماجی موضوعات اور سماجی مسائل پر ان کا عمیق روپ ملتا ہے۔ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں "تنہائی"، "بوریت"، "بے کاری اور بے روزگاری"، "خاموشی"، "جھوٹ سچ"، "خبر کی بھوک" وغیرہ ایسے انشائیے ہیں جن کا تعلق سماجی مسائل سے ہے۔جدید دور میں جہاں پوری دنیا انٹرنیٹ کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آگئی ہے اور Global Village کی صورت اختیار کر گئی ہے وہیں ساتھ بیٹھے شخص کو دوسرے سے جدا کر دیا کیوں کہ اس دور میں ایک شخص اپنے پاس بیٹھے رشتوں ماں، بہن، بھائی، بچوں، دوستوں اور عزیز رشتے داروں سے مکالمہ کرنے کے بجائے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی دنیا میں کھو گیا ہے۔اس طرح قریبی رشتے نظر انداز ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی تنہائی کا شکار ہوتے چلے جا رہے

ہیں، جہاں پہلے لوگ مل جل کر رہتے تھے وہیں اب حالات کی بدلتی اس تیز روی نے انسان کو ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنا دیا ہے۔ آج کی شہری زندگی کو ہی اگر لیا جائے تو ایک گھر میں رہنے والوں کو نہیں پتہ ہو گا کہ ان کے پڑوس میں کون رہ رہا ہے؟ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ یہ بھی نہیں پتہ ہوتا ساتھ والے کمرے میں کون کس حال میں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آج کے سماج کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان تنہائی کا شکار ہو گیا ہے۔ جس سے بوریت کا احساس بڑھ گیا ہے۔ ناصر عباس نیر معاشرتی اقدار کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ انشائیہ "تنہائی" میں جدید دور کی خستہ حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> "بیسویں صدی کے آخری عشرے میں رشتوں کا "کُل" اتنے ٹکڑوں میں بٹ گیا اور اِدھر اُدھر بکھر گیا ہے کہ انھیں پھر سے جوڑ کر کل کو بحال کرنا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ فی زمانہ انسانی تہذیب نے "ہم" سے "میں" کی جانب پیش قدمی کی ہے، اور افراد سے لے کر اشیا تک میں "میں" کے شعور کو بھی شامل سمجھنا چاہیے، جس کی گونج ذہن کے نہاں خانوں میں لرزش پیدا کر رہی ہے۔ بظاہر تو سٹیلائٹ نے پوری دنیا کو ایک بستی میں بدل دیا ہے اور ہم کرہ ارض کے کسی کونے کھدرے میں ہونے والی تبدیلی سے فوراً با خبر ہو جاتے ہیں، دور دراز کے براعظموں اور جزیروں کی خبریں ہمیں اپنے محلے کی روز مرہ زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں مگر پھر بھی ہم کتنے تنہا اور ارد گرد سے کتنے اجنبی ہیں!"[۶]

ناصر عباس نیر نے اس میں مشینی دور کی تبدیلی کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ رشتوں کا کھوکھلا پن اور وجود عیاں ہو گیا ہے جو کہ صنعتی دور کی بڑی پیداوار ہے اور بیسویں صدی میں رونما ہونے والی بڑی تبدیلی کا موجب ہے۔ مشینی اقدار کے دور کا مارا ہوا انسان تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہو چکا ہے۔ صنعت اور ٹیکنالوجی کی دنیا نے انسانی اقدار کی نفی کی ہے۔ اس تنہائی سے معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی ناصر عباس نیر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اس کے لیے انسانی رویوں کو بیان کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس صدی میں

نشہ آور چیزوں کے بے تحاشہ اضافے کا سبب انسان کی تنہائی ہے۔ تنہائی سے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں جن میں نفسیاتی الجھنوں، ذہنی انتشار، منشیات کے استعمال اور خود کشی کی انتہائی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ جس کو ناصر عباس نیر انشائیے "قلم" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آدمی کا ایک بڑا مسئلہ تنہائی ہے جس کی جڑیں سماجی رشتوں سے لے کر کائنات سے انسان کے تعلقات تک پھیلی اور اتری ہوئی ہیں۔ قلم تنہائی کے خوفناک اور المناک احساس کا تیر بہدف علاج ہے۔ اسٹیٹس، شہرت، جنس اور مادی آسائشوں کا بوجھ اسی تنہائی سے نجات پانے کا وسیلہ ہیں، مگر اس سے تنہائی گھٹتی نہیں۔ اگر گھٹ سکتی تو امرا اور عیش پسند لوگ کبھی خود کشی نہ کیا کرتے۔"(۷)

جدید معاشرتی زندگی کا المیہ فرد کی تنہائی اور اکیلا پن ہے۔ انسان ہجوم کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرنے پر مجبور ہے۔ صنعتی معاشرے نے جذباتی رشتوں کو ناپید کر دیا ہے اور فرد اس کی بدولت پیدا ہونے والی صورتحال سے تنہائی کے صحرا میں بھٹک رہا ہے اور مسلسل بوریت محسوس کرتا ہے۔ اس پر ناصر عباس نیر نے پورا انشائیہ قلم بند کیا ہے وہ اس انشائیے "بوریت" میں لکھتے ہیں۔

"بوریت کو ہمارے زمانے نے طرۂ امتیاز کی طرح سر پر سجا رکھا ہے بلکہ سوار کر رکھا ہے۔"(۸)

انہوں نے اس انشائیے میں بوریت کا سبب انسان کی کاہلی کو قرار دیا ہے۔ جس نے زندگی سے لطف اندوز ہونے اور مسائل کے حل کے لیے مشین اور نوکر تور کھ لیے مگر یہ لطف عارضی ہے۔ جس کے بعد انسان خود کو تنہا اور بور محسوس کرنے لگتا ہے کیوں کہ اس نے اپنی ذمہ داریاں دوسروں کے کندوں پر ڈال دیں۔ جس سے نہ صرف نفسیاتی مسائل جنم لیتے ہیں بلکہ کاہلی انسانی جدوجہد کے آڑے آ جاتی ہے۔ ناصر عباس نیر اس لمحے کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اس میں ترقی اور خوشحالی کا خواب دیکھتے ہیں اور اس لمحے کو خود شناسی کے عمل سے گزارنے کے لیے مختص کرتے ہیں اور بوریت کا انتظار کرتے ہیں۔ انہوں نے انسان

کے اس سماجی رویے کو بھی قلم بند کیا ہے جو فرد کی خود غرضی کا موجب ہے۔اس نے دوسرے انسانوں کے ساتھ مستقل رابطے قائم کیے ہوئے ہیں مگر اب وہ گہرے جذبات اور احساسات سے عاری ہو چکا ہے۔اور اب اس میل ملاپ کا دارومدار انسانی ضروریات تک محدود رہ گیا ہے۔جو ایک بڑے سماجی مسئلے کا مرتکب ہے۔ یہ میل ملاپ بھی اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ دوسرا اس کے کسی مقصد کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکے۔ یہ صورتحال فرد کی خود غرضی کا نوحہ ہے جس کا جائزہ جابجا ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں ملتا ہے۔جیسا کہ "شہرت کی مخالفت میں" سے اقتباس دیکھئے۔

"سماج مشہور آدمی کو اپنے "سفارتی مقاصد" کے لیے استعمال کرتا ہے۔ زندگی میں اسے "لابی اسٹ" کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی وفات کے بعد اسے مجسمے یا تصویروں کی شکل میں میوزیم میں سجا دیا جاتا ہے تاکہ کلچر کے نمائندے کا کام دے سکے۔"(۹)

ان سب مسائل کا سامنا ہمیں دیہاتی زندگی کے برعکس شہری زندگی میں زیادہ ہے۔شہری سماج کی فضا محبت کی کمی،خود غرضی اور اجنبیت ہی سے آلودہ نہیں بلکہ یہاں کے لوگ تازہ ہوا کو بھی ترستے ہیں۔انشائیہ "شام" میں اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں اگر یہی سلسلہ چلتا رہا تو صبح وشام کی دید کے لیے بھی طالب علموں کے لیے ایک پریڈ مختص کرنا پڑے گا۔ان کے ہاں ہمیں تہذیب کا نوحہ بھی ملتا ہے جس میں جدید اور قدیم کے حالات کا تقابل کیا گیا ہے لیکن ان کے مطابق تہذیب میں سانسیں اس وقت تک باقی رہتی ہیں جب تک کہ ایک تخلیقی شخصیت سماج میں موجود ہو جس کی طرف اشارہ ان کے انشائیے دائرہ در دائرہ میں کیا گیا ہے۔اسی طرح جدید اور قدیم کے سنگم میں لکھا گیا انشائیہ "تانگہ" بھی اہمیت کا حامل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مغربی معاشرے پر طنز بھی باخوبی ملتا ہے۔انشائیہ "سرما کی دھوپ" سے اقتباس دیکھیے

"جسم کی خوشبو سے مشام جاں کو عطر بیز کرنے کا انوکھا ڈھنگ اہل مغرب نے اپنا رکھا ہے۔وہ سردیوں کی مخملی دھوپ میں سمندر کنارے اپنے بدن کو تہذیب کے ہر چولے سے آزاد کر دیتے ہیں۔شاید اس لیے

کہ ان کے بدن پر تہذیب کا لیپ کچھ زیادہ ہی گہرا ہوتا ہے جو ایک طرح
سے جسم کی نفی کا عمل ہے۔"(۱۰)

جدید دور میں فرد مغرب سے خاصا متاثر ہے لیکن انہوں نے مغربی تہذیب پر نہ صرف طنز کیا ہے بلکہ مشرقی عورت کی پردہ داری کی داستان بھی رقم کی ہے۔ انشائیہ "خواہش" میں لکھتے ہیں:

"خواہش مشرقی عورت کی مثل ہے، جو اپنے چھپنے کے اسلوب ہی میں
عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ خواہش ننگے بدن تو کیا کبھی ننگے پیر اور ننگے سر
بھی اپنے مسکن سے باہر نہیں نکلتی۔ وہ اپنی شناخت کو ہزار پردوں اور
پیرایوں میں مستور رکھنے کی عادی ہے۔"(۱۱)

سماج میں جب معاشی، سیاسی، فکری اور صنعتی انقلاب رونما ہوتے ہیں تو ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ انسان جیسے جیسے اپنا زاویہ نگاہ بدلتا ہے پرانی اقدار دم توڑتی جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی اقدار جنم لیتی ہیں جو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر سماج میں ایک بڑی تبدیلی کا باعث بنتی ہیں۔ جو جدید حالات کے تقاضوں کا ادراک کر کے فکر و احساس کو نئی سمت دے کر مثبت صورتحال پیدا کرنے کی موجب بنتی ہیں۔ معاشرہ بیک وقت بہت سی تبدیلیوں کو قبول کرتا ہے اور یہ تبدیلیاں بیک وقت رونما نہیں ہوتی بلکہ سماج حالات کے تقاضوں کے مطابق ان تبدیلیوں کو خود میں جذب کرتا چلا جاتا ہے۔ جن سے منہ موڑنا سماجی مسائل کو دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ ناصر عباس نیر نے "بے کاری اور بے روزگاری" جو جدید دور کا اہم سماجی مسئلہ ہے۔ اس میں بے روزگاری کو سماج کی کوکھ سے جنم لینے والی کالی ڈائن سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بے روزگاری کی زد میں آئے ہوئے معاشرے کا باطن کھوکھلا، بدبودار
اور ظاہر نفرت، جرائم اور انتقام سے لیس ہوتا ہے۔ بے روزگار افراد
تپتے صحرا میں ننگے پاؤں چلنے والی ان بلیوں کی مانند ہیں جو پاؤں جلنے پر
اپنے ہی بچوں کو تلوؤں کے نیچے ڈال دیتی ہیں۔"(۱۲)

ناصر عباس نیر نے بے روز گاری جیسے اہم سماجی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس معاشرے کی تصویر کشی کی ہے کہ کیسے بے روز گاری کی زد میں آیا ہوا معاشرہ نہ صرف سماجی مسائل کا باعث بنتا ہے بلکہ بے روز گار معاشرے کا بے کار فرد ہے۔ کیوں کہ بے روز گاری بے کاری کا سبب بنتی ہے جو مایوسی کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس مایوسی سے ایک اور رویہ جنم لیتا ہے اور وہ ہے محنت سے اکتا کر روپیہ کمانے کے دیگر آسان ذرائع کی تلاشی جو سماج کی بقا اور سالمیت کے لیے انتہائی خطرناک راستہ ہے۔ اسی رویے سے جرائم کے سوتے پھوٹتے ہیں جو سارے سماج کو تہس نہس کرتے دیتے ہیں۔ بے روز گاری کی صورت پیدا ہونے والی انتہائی صورت بھی انسان کو کاہل بنا دیتی ہے اور انسان خود بھی سست ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتحال سے جنم لینے والے رویے کو ناصر عباس نیر "معنی" میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"آدمی نے کاہلی کو اپنی فطرت ثانیہ بنا رکھا ہے۔ اس لیے وہ ایک مسلسل غنودگی میں مبتلا ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی حادثہ پیش نہیں آتا اس کی نیند نہیں ٹوٹتی۔"(۱۳)

خانگی حالات کی بہتری کا انحصار معیشت پر ہوتا ہے اور معاشی ترقی کا انحصار افرادی قوت پر لیکن سماجی ناانصافی سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے جب روشن ذہن سماج میں روشنی پھیلانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو سماج جبراً انہیں بے بس کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے عملی اس سماج کی پیداوار ہے۔ اس صورتحال سے منفی رویے جنم لیتے ہیں سب سے بڑھ کر جو صورتحال ناصر عباس نیر نے بیان کی ہے وہ فرد کی کاہلی ہے۔ کیوں کہ منفی رویوں نے سماجی قدریں چھین کر انسان کو اس قدر بے بس کر دیا ہے کہ وہ محنت کرنے سے بھی کتراتا ہے۔ عصری صورتحال کے سیاسی، سماجی پہلو ان کے انشائیوں میں نمایاں طور پر موضوع بن کر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے سماجی مسائل کا تعلق سیاست سے بھی منسلک کیا ہے اور سیاستدانوں کے سیاسی رویوں پر بھی تنقید کی ہے۔ ادب سیاسی رویوں پر اظہار خیال کے بغیر نامکمل ہے۔ ڈاکٹر عنبرین شاکر جان ادب اور سیاست پر بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے مظاہر میں سیاست بھی شامل ہے۔ اپنے زمانے کے سیاسی

رویے جانے بغیر ادیب بڑے فن پارے کی تخلیق نہیں کر سکتا کیوں کہ اس تخلیقی عمل میں عصری شعور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔لہذا بڑا ادیب نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کے سیاسی رویوں سے آشنا ہوتا ہے بلکہ وہ ماضی کے جھروکوں سے جھانک کر زمانہ گزشتہ کے احوال کو بھی دیکھتا ہے۔"(۱۴)

انہوں نے معاشرے کو پسماندگی کی طرف لے جانے والے عوامل کی نشان دہی کرتے ہوئے ان عوامل کا تجزیہ پیش کیا ہے۔اس میں سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بننے والے سیاستدان ہیں انشائیوں میں متعدد مقامات پر ایسی صورتحال ملتی ہے۔انشائیہ بے کاری اور بے روزگاری میں سیاستدانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سیاستدان اکثر خود کو مصروف رکھنے کی خاطر عوام کی تقدیر سے کھیلتے ہیں۔اگر ان سب کو ایک سال کی چھٹی پر افریقہ کی سیاحت پر بھیج دیا جائے اور یہ خاص احتیاط کر لی جائے کہ ان کے ساتھ ٹی وی، کیمرے اور رپورٹر نہ ہوں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وطنِ عزیز کے عوام اطمینان اور تحفظ سے بہرہ یاب ہو سکیں گے۔رہ گئے افریقہ والے تو ان کے ساتھ اظہار ہمدردی ہی کیا جا سکتا ہے۔"(۱۵)

انہوں نے سیاسی اور معاشرتی نظام کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے بالخصوص سیاست دانوں کو مسائل کی جڑ قرار دیتے ہیں اور ان کی غیر ذمے دارانہ روش کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے انشائیہ "سفر جاری رکھنا ہے" میں مسلسل بڑھتے جانے اور سفر کے چراغ کو مسلسل جلائے رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے وجود کی معنویت کے بغیر اور زمین پر مخلوق کی معنوی حیثیت کا ادراک کراتے ہوئے بھی سیاستدانوں کے سیاسی مقاصد کے حصول کو نشانہ بنایا ہے اور ان پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں اگر زمین پر انسان کے وجود کا کوئی مقصد نہ ہوتا تو زمین ویران ہوتی اور انسان کے مشاغل میں سیاست

اور کمرشل ازم ناپید ہوتی۔ ان کے انشائیوں سے عام تاثر یہ ملتا ہے کہ کسی بھی ملک و قوم کی بقا ترقی اور خوشحالی کا دارومدار انسان کے پر سکون ہونے میں ہے۔ اگر وہ مکاری اور فریب کا لبادہ اتار کر خالص ہو جائے، خود کو کسی سے کم تر یا برتر سمجھنا بند کر دے اور زندگی کے حسنِ معنی کو تلاش کرے تو زندگی کے عظیم مقاصد کو پا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں فطرت میں چھپی رنگینیاں انسان کو پر سکون بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

انہوں نے انشائیوں میں سماج کی فرسودگی، سیاسی ناہمواریاں، تہذیب کی بدنمائی کو اجاگر کرنے اور اس کی اصلاح پر لوگوں کی توجہ مرکوز کروائی ہے۔ جیسا کہ انشائیہ "خبر کی بھوک" میں خبر کی جستجو اور تشہیر کے معاملے کو انسانی تجسس اور وقت کی تیزی میں مرتے انسانی احساسات و محسوسات جو خبر کی سرخیوں کی طرح بدلتے جا رہے ان کو بیان کیا ہے جو ایک المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ بہتر حسین اور خوبصورت سماج کی تعمیر و تشکیل پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں اخلاقیات کا پرچار، سوچنے کی دعوت سماج اور زندگی کو بہتر بنانے کی سعی کی ہے۔ جس کے لیے سماجی مسائل کو قلم بند کیا۔

ب۔ نفسیاتی

بیسویں صدی کے آغاز سے ذہنی مطالعے نے نفسیات کی حیثیت اختیار کی۔ تحلیل نفسی کے ماہرین کی دریافتوں نے انسانی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کی وضاحت کر کہ شعر وادب کی دنیا میں بھی انقلاب پیدا کیا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے ادب میں نفسیاتی بصیرت کو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیا ہے ان کے مطابق یہ بصیرت ہی ہے جس کی وجہ سے فنکار اپنے قاری کو متاثر کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر سرمست ادب میں نفسیاتی تجزیے پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "نفسیاتی تجزیے سے مراد یہاں تحلیل نفسی نہیں ہے بلکہ واقعات اور کرداروں کا ایسا بیان ہے جس سے نفسیاتی محرکات کی طرف ذہن منتقل ہو۔ تحلیل نفسی کرنا ادیب کا کام نہیں یہ تو ماہر نفسیات کا منصب ہے۔ ادیب اور شاعر نفسیات کے عمیق ترین مسائل کو بھی بیان کر جاتا

ہے اور لاشعور کی کیفیات کو بھی لیکن وہ یہ سب کچھ داخلی انداز میں کرتا
ہے جبکہ ہر نفسیات کا طریقہ خارجی ہوتا ہے۔"(۱۶)

نفسیات بنیادی طور پر انسانی ذہن اس کے خیالات احساسات اور اس سے سرزد ہونے والے افعال کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کا آغاز علم اور روح کے مطالعے کی حیثیت سے ہوا تھا۔ ماہرین نے اس کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں لیکن سب کی آراء میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جس ایک نقطہ پر ماہرین متفق ہوئے اس کے مطابق اس کو ذہن کا علم کہا جاتا ہے۔ نفسیات کو انگریزی زبان میں "Psychology" کہا جاتا ہے جو دو الفاظ Psyche اور Logy کا مرکب ہے۔ یونانی زبان میں سائیکی کا مطلب روح نفس اور ذہن وغیرہ کے ہیں اور لوجی علم حاصل کرنے اور جاننے کو کہتے ہیں یعنی علم ذہن۔ فرائڈ کو اس علم کے بانیوں میں درجہ حاصل ہے اس کے نزدیک نفسیات کے لحاظ سے ذہن کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ا۔ "شعور" جو زندگی کے فوری جذبات کا احاطہ کرتی ہے۔ ۲۔ "تحت الشعور" میں وہ افعال شامل ہیں جو فوری طور پر شعور میں داخل ہو سکتے ہیں اور ۳۔ "لاشعور" اس میں وہ اعمال شامل ہیں جن کا ہمیں بظاہر علم نہیں ہوتا لیکن وہ ذہن کے کسی کونے میں ہونے کے باعث انسان کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں۔ سگمنڈ فرائیڈ اس میں سے لاشعور کو زیادہ فوقیت دیتا ہے۔ شکیل الرّحمٰن ادب اور نفسیات میں لاشعور کے پس منظر میں لکھتے ہیں۔

"شعور جب لاشعور کے خلاف محاذ بناتا ہے تو اس بغاوت کے اثرات سے
فنکار دور نہیں رہ سکتے موجودہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ تخلیقی کام کی
بنیاد انسان کی وہ اصلی جبلتیں ہیں جو فطری طور پر موجود رہتی ہیں۔ یہ
جبلتیں کبھی علیٰحدہ نہیں رہتی بلکہ ایک دوسرے سے مل کر فنی تخلیق میں
معروف رہتی ہیں۔ کچھ جبلتیں لاشعور کے پس منظر میں اور کچھ پیش
منظر پر رہتی ہیں۔"(۱۷)

انسانی نفسیات کو جاننا اور سمجھنا ایک ماہر نفسیات کا کام ہے ادیب معاشرے کی احساس ترین شخصیت ہوتا ہے۔ جو اپنے تجربے کو قلم بند کرتا ہے جس سے انسانی نفسیات بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ محمد حسن اپنی کتاب "معاصر ادب کے پیش رو" میں لکھتے ہیں۔

"ذہنی اور جذباتی رویوں کے اس عمل دخل سے کوئی ذی روح بچ نہیں سکتا خواہ وہ آرٹ کے پروں پر اڑ کر، ڈرامائی سرحدوں کی سیر ہی کیوں نہ کرتا ہو اس کی ہر بات اس کے ذہنی اور جذباتی رویے کی غماز ہے وہ تجربے جنھیں وہ دوسروں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، وہ تجربے جنھیں وہ ادا کرتا ہے۔ اس کی گفتگو، اس کے الفاظ، اس کی خاموشیاں، اس کے ماتھے کی شکن، سب کچھ اس کے ذہنی اور جذباتی رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔"(۱۸)

انسان کی ہر بات اس کے ذہنی اور جذباتی رویے کی عکاس ہے۔ اس کی گفتگو کا انداز ہو یا پھر اس کی خاموشی۔ چاہے کوئی بھی انسان کی ظاہری حالت ہو اس کے پس پردہ عوامل میں اس کی گہری نفسیات ہی شامل ہوتی ہیں جو اس کی فطری تسکین اور اس کی ضروریات زندگی پر مشتمل ہوتی ہے۔ چونکہ انشائیہ ادیب کی ذاتی زندگی کا عکاس ہوتا ہے پھر چاہے وہ معاشرے میں تناؤ کا شکار ہو یا خوشحال اس کا نفسیات سے گہرا تعلق ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر صنف انشائیہ نگاری میں انشائیہ نگار اور نفسیات کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انشائیہ نگار انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔ انشائیہ نگار کا مقصد کسی نقطے کی وضاحت یا نظریے کی ساخت نہیں، نہ وہ کسی امر کی شعوری طور پر تردید کرتا ہے اور نہ ہی تائید وہ تو لطیف انداز اپنا کر قاری کو اسی نسوانی روح سے گویا ہوتا ہے جسے عام زندگی میں شعوری طور سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔"(۱۹)

نفسیاتی مطالعہ دو طرح کا ہوتا ہے خارجی اور داخلی کیوں کہ انسانی نفسیات پر یہ دونوں محرکات کاربند ہوتے ہیں۔ انسان کا باطن اس کے خارجی ماحول سے جڑا ہوا ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیے انسان کے باطن اور خارج دونوں پر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں جن انسانی نفسیات کو اجاگر کیا ہے ان میں انسان کی چھپی ہوئی پیچیدہ حقیقتیں ہیں۔ انسان تنہائی میں کیسا محسوس کرتا ہے کسی خوشی اور غم کے موقع پر یا پھر بے روزگاری اور بیماری وجہ کوئی بھی ہو ناصر عباس نیر انسان کی محسوسات کے چھپے ہوئے گوشوں کو اجاگر کر کے ایک نئی راہ دکھاتے ہیں۔

انسان کی خوشی اور سکون قلب کا انحصار اس کے رویوں پر ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں بے اطمینانی، بے سکونی اور نفسیاتی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ انسان اپنے ماحول سے اکتایا ہوا اور مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ اس کی وجوہات میں جہاں اور اسباب شامل ہیں وہاں فرد کی انفرادی حیثیت بھی کار بند ہے۔ خاموشی میں چھپی انسان کی نفسیات کو ناصر عباس نیر انشائیہ "خاموشی" میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "انسان پوری عمر جبر سے آزادی پانے میں کوشاں رہتا ہے کہ انسان کی حقیقی مسرتیں "آزادی" کی مرہونِ منت ہیں۔ اظہار بھی تو ایک جبر ہے۔ ہم اپنے احساس تنہائی کو مٹانے یا دوسروں کی خوشنودی پانے کی خاطر اظہار کے طویل سلسلے کے غلام ہیں۔ اظہار ہمارے پاؤں کی زنجیریں ہیں، خاموشی انھیں توڑتی اور ہمیں ہوا کی طرح سبک اندام کر دیتی ہے۔"[۲۰]

یہ ایک نفسیاتی عمل ہے کہ انسان بہت عرصہ ترش رویوں کو برداشت کرنے کے بعد ایک دن سارا غبار نکال دیتا ہے اور اس عمل کے بعد وہ اس بوجھ سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ اور خیال اپنے دماغ میں لے کر آتا ہے تو اسے حاصل کرنے میں کوشاں ہو جاتا ہے اور اس سب میں سب سے زیادہ اہم آزادی ہے۔ انسان کسی نا کسی صورت میں مختلف قسم کی پابندیوں میں گھیرا ہوا ہے اور وہ ہر وقت ان سے آزادی چاہتا ہے۔ انسانی کی نفسیات میں شامل ہے کہ یہ مکمل آزادی چاہتا ہے۔ خود پر انسان کسی قسم کی روک ٹوک قبول کرنے کا قائل نہیں خود مختار رہے اور ساری زندگی اسی میں گزار دیتا ہے کہ اس پر روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں کچھ حاصل کرنے کے لیے انسان کو اس کا اظہار کرنا پڑتا ہے وہیں دوسری طرف یہ اظہار ہمت طلب کام ہے جو ہر شخص نہیں کرتا مگر جب وہ یہ اظہار کر دیتا ہے جو کچھ بھی اس کے دل میں ہو نکال دے تو اس کو ایک لا حاصل سکون مل جاتا ہے۔ ایک فرد کے اندر ہی اندر مختلف نفسیاتی افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ناصر عباس نیر ان کا تجزیہ بالکل ایک ماہر نفسیات کی طرح کرتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کی نفسیات کا بخوبی مطالعہ ان کے انشائیے "میرا ننھا استاد" میں ملتا ہے۔ بچوں کی نفسیات کے بارے انشائیہ "کیا گزرے ہے" میں لکھتے ہیں۔

> "بچے چونکہ باپ کے ذہنی تحفظات سے بے خبر اور آزاد ہوتے ہیں، اس لیے وہ باپ کو دیکھتے ہی اپنے ننگے، غبار آلود جسم کے ساتھ باپ سے آن لپٹتے ہیں۔ذات کے فراموش کردہ حصے بخرے بھی آدمی کے اندر شور مچانے لگتے ہیں۔"(۲۱)

فرد کے چاہے جتنے بھی رشتے ہوں ان میں سب سے قریبی اور مضبوط رشتہ والدین کا ہوتا ہے۔ والدین اور اولاد کے تعلق میں فطری انسیت پائی جاتی ہے۔نفسیات کے ماہرین کے مطابق بچے والدین کے جذبات و خیالات اور سوچ سے عاری ہوتے ہیں۔والدین ہمیشہ بچوں کی بھلائی کے لیے اقدامات اٹھاتے ہیں لیکن بچے اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔باپ کسی بھی ذہنی حالت میں مبتلا ہو لیکن بچے اس بات سے بے خبر جب ان سے آن لپٹتے ہیں تو فرد کی اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے اس انسانی فطری کیفیت کو ناصر عباس نیر نے اس اقتباس میں بڑی خوبصورتی سے سمیٹا ہے کہ کیسے انسان کی ذات میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔اسی طرح انشائیہ "شام" میں آدمی کی نفسیات اس طرح پیش کرتے ہیں۔

> "آدمی پر اس کی انا اس قدر حاوی ہے کہ وہ "اپنے" اور اپنے "کمالات" کے سوا ہر شے سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے۔اکثر تو وہ خدا بھی بننے لگتا ہے...خدا نے اسے پاؤں دیے مگر وہ پر مانگتا ہے۔اسے ضرورت کے لیے دو چار گز زمین چاہیے مگر وہ پورے کرۂ ارض پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا اور ستاروں تک کمندیں ڈالتا ہے۔"(۲۲)

انسان کے خودی کے رویے ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔یہ مسلسل خواہشات کی منزل پانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔انسانی نفسیات اس چیز کی ضامن ہے کہ انسان ہمیشہ زیادہ کی تلاش میں لگا رہتا ہے اور زندگی کی راحتیں بھی کھو دیتا اس پر اس کی انا اس قدر حاوی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ وہ ہی وہ ہے دوسرے کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔اس میں ناصر عباس نیر انسان کے اس رویے کی بھی عکاسی کرتے ہیں کہ خدا نے اس کو نعمتوں سے مالامال کیا ہے مگر وہ مسلسل اسی جستجو میں لگا ہے کہ تمام کرۂ ارض پر کسی طرح قابض ہو جائے اگر اس پر بھی قابض ہو جائے تو اس کی خواہشات کہیں بھی رُکتی نہیں دنیا میں

انسان اپنا مقصد بھول چکا ہے۔ انسان مسلسل اس کوشش میں لگا ہے ستاروں تک پہنچ جائے یعنی موجودہ نعمتوں میں خوش نہیں رہتا یہ سب اس کی نفسیات میں شامل ہے۔ جن کا عمدہ بیان ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں جابجا ملتا ہے۔ جذبات انسانی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ احساس برتری اور کچھ احساس کمتری کا شکار ہیں جو خالص نفسیاتی مسئلہ ہے۔ انشائیہ "معنی" میں ناصر عباس نیر لکھتے ہیں۔

> "کیسی عجیب بات ہے !ایک طرف آدمی عظمت، رفعت اور کشادگی کا والا و شیدا ہے اور دوسری طرف وہ مسلسل خود کو مختار رکھتا ہے۔ آدمی میں بیک وقت شاہ اور گدا موجود ہیں۔ چاہنے کے عمل میں وہ بادشاہ ہے مگر پانے کے سلسلے میں اس کا طرزِ عمل گداؤں جیسا ہے۔"(۲۳)

تغیرات کا مسلسل شعوری بہاؤ انسان کی ذہنی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ شعور کا یہ نقطہ نظر انسان کی احساس ہے۔ جہاں انسان کسی کی حکمرانی خود پر نہیں ہونے دینا چاہتا خود مختار ہے۔ وہیں ناصر عباس نیر انسان کے اس پہلو کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ انسان کچھ حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے کوئی بھی حد پار کر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا عمل گداؤں جیسا ہے وہ دوسروں کی حق تلفی کرنے سے بھی عاری نہیں بلکہ دوسروں کے حق پر قابض ہونے کے لیے انسانوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں بھی لگ جاتا ہے۔ انسانی خصلت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے کام آئیں مگر خود وہ کسی کی مدد کرنے سے عاجز ہے۔ اسی طرح ناصر عباس نیر نے انسانی نفسیات کے پیچھے کارفرما عوامل کی نشان دہی کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ انشائیہ "قلم" میں لکھتے ہیں۔

> "انسان کے احساس تنہائی کو ابھی پوری طرح سمجھا ہی نہیں گیا۔ اسے سماجی، معاشی یا زیادہ سے زیادہ نفسیاتی مسئلہ قرار دیا گیا ہے اور نفسیاتی مسئلے کے پیچھے بھی سماجی اور معاشی عوامل کارفرما سمجھے گئے ہیں حالاں کہ تنہائی ایک خالص انسانی اور روحانی مسئلہ ہے۔"(۲۴)

آج کے دور میں انسان کی نفسیات اور طرز فکر میں تبدیلی رونما ہوئی ہے جہاں اس نے قدیم تصورات سے باہر قدم رکھا ہے وہاں دوسری طرف غفلت اور بے سکونی دونوں نے اس کا دامن تھام لیا

ہے۔ناصر عباس نیر ان عوامل کا تجزیہ کرتے ہیں جو فرد کی تنہائی جو جدید دور کا بڑا مسئلہ ہے اس کے پیچھے کار فرما عوامل کا مکمل جائزہ لیتے ہیں اور انسان کی ان گہری نفسیات کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں جس کے پس پردہ عوامل کو نفسیاتی مسائل قرار دیا گیا ہے۔یا پھر اس کو سماجی اور معاشی مسئلہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ناصر عباس نیر اس کو خالص روحانی مسئلہ قرار دیتے ہیں کیوں کہ انسان روحانیت کی وہ منازل اس تنہائی میں پالیتا ہے جو روز مرہ کے معمول میں حاصل نہیں ہو پاتی۔تنہائی میں وہ روحانیت کی منازل کو پالیتا ہے اور اس پر دنیا کی حقیقت کھل جاتی ہے کہ دولت دنیاوی مقام ور تبہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔تنہائی کے نفسیاتی مسائل سے بچاؤ کے لیے ناصر عباس نیر نے قلم کی طاقت کو اس کا بہترین علاج قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک قلم وہ طاقت ہے جس سے انسان وہ شرف حاصل کر سکتا ہے جو اسے اندھیرے میں راستہ دکھاتا ہے اور تنہائی میں دامن تھام کر روشنی سے منور کرتا ہے۔ان کے انشائیوں میں کیا گزرے ہے، تنہائی، بوریت، خوشی، خواہش، خاموشی، ایسے انشائیے ہیں جو احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اور یہ احساسات ہی نفسیاتی عوامل کا اظہار ہیں۔ان کے انشائیے شعوری اور لاشعوری کیفیات کا عمدہ بیان لیے ہوئے ہے۔

ج۔ادبی

ادبی موضوعات سے مراد وہ موضوعات ہیں جن کا براہ راست تعلق ادب سے ہو اس کے لیے یہ علم ہونا ضروری ہے۔ادب کیا ہے ؟ادب کا تعلق فرد کے تخلیقی عمل سے ہے۔ادب عربی زبان کا لفظ ہے جو تہذیب اور اخلاق کے معنی رکھتا ہے۔انگریزی زبان میں اس کے لیے لٹریچر (Literature) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جو لاطینی زبان کے لفظ Littera سے وجود میں آیا۔اردو ادب میں ان تحریروں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان میں عمدہ اخلاق پیدا کرتی ہیں۔ادب کی وضاحت گوہر ادب میں صدف نقوی نے اس طرح سے کی ہے۔

> "ادب عربی زبان کا لفظ ہے اور قدیم عربی میں اس سے مراد دعوت طعام تھی چونکہ عرب معاشرے میں مہمان نوازی حسن اخلاق کی علامت تھی لہذا ادب کا لفظ تہذہب و اخلاق کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔اسلام کی

پہلی صدی میں ادب میں تعلیم کا مفہوم بھی داخل ہو گیا کیونکہ تعلیم کی طرح
ادب کا مقصد بھی انسان کے اندر شائستگی پیدا کرنا تھا لہذا ادب کا لفظ ان
تحریروں کے لیے جو انسان کے اندر عمدہ اخلاق پیدا کر سکتی تھیں۔ ان کے
لیے استعمال ہونے لگا۔"[۲۵]

ادب ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے اس کی تعریف میں چند الفاظ یا جملے کہے جا سکیں۔ یہ ممکن نہیں اس کی تعریف کرتے ہوئے ناقدین میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں کچھ کے مطابق ادب میں موضوع کو خاص اہمیت حاصل ہے اور کچھ ناقدین اس کی ساخت اور ہیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ادب فرد کی بلند فکری اور فہم کا وہ اظہار ہے جس کا ہنر ہر ذی روح کے پاس نہیں یہ فکری اور فنی سطح پر دی ہوئی وہ خداداد صلاحیت، ہمت اور طاقت ہے جس کی مدد سے ادیب کچھ تخلیق کر پاتا ہے۔ ہر تحریر بھی ادب نہیں ہوتی یہ بھی ایک طویل بحث ہے کہ ہم کس تحریر کو ادبی اور کس کو غیر ادبی کہیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اشارات تنقید میں ناقدین کی تعریفوں سے اخذ شدہ ادب کی جو تعریف متعین کی ہے جس کی مدد سے ادب کی کچھ صحیح معنی میں صورت سامنے آتی ہے وہ اس طرح ہے۔

"ادب وہ فن لطیف ہے' جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خاص
نفسیاتی و شخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے
واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و
تنقید بھی کرتا ہے جن سے سامع و قاری کا جذبہ و تخیل بھی تقریباً اسی طرح
متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا۔"[۲۶]

ناصر عباس نیر نے ادبی موضوعات کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی ہے۔ نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی سطح کے ادیبوں کے حوالے بھی ان کے انشائیوں میں ملتے ہیں۔ عالمی سطح کے تخلیق کاروں کے اردو تراجم پر گہری نظر ہونے کی بنا پر جا بجا ان کے انشائیوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ جس سے ناصر عباس نیر کی علمی بصیرت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ناصر عباس نیر انشائیے "کمرہ" میں کمرے کی تنہائی کے روحانی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مختلف مثالیں پیش کرتے ہیں جس میں انگریزی فلم کے ہیرو کی مثال جس نے پابند سلاسل

میں چڑیوں کے موضوع پر کتاب لکھی جو ایک گہرا تحقیقی مقالہ بن گئی یہ صرف کمرے کی تنہائی کی بدولت ممکن ہوا۔ اسی طرح عالمی افسانہ نگار چیخوف کے افسانے "شرط" کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس موقع پر مجھے چیخوف کے افسانے "شرط" کا وکیل ہیرو بھی یاد آرہا ہے، جس نے معمولی سی بات پر شرط بِد کر ایک علیٰحدہ کمرے میں پندرہ برس گزار دیے۔ جب وہ شرط کے تحت مقرر کی گئی قید تنہائی کو جھیل چکا اور ایک بھاری رقم جیتنے کا مستحق ٹھہرنے والا تھا تو صرف چند گھنٹے پہلے کمرے سے بھاگ گیا، اور یوں بھاری رقم کو لات مار دی کہ کمرے کے طویل قیام نے اس پر زندگی کا ایک دوسرا معنی منکشف کر دیا تھا۔ اس کی نظر میں سماجی زندگی کے مناصب و مراتب کا سر بفلک بُت بالکل بھر کر رہ گیا تھا۔"(۲۷)

ناصر عباس نیر قاری کو اس حقیقت سے روشناس کروانا چاہتے ہیں کہ معمول کے مطابق فرد کو کمرے میں تنہائی کاٹ کھانے کو محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس کے صحیح معنی کسی پر عیاں ہو جائیں تو وہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی ترقی کی منازل بھی طے کر لیتا ہے۔ اس کی مثال عالمی ادب سے پیش کی کہ کس طرح اس افسانے کے ہیرو نے معمولی سی شرط کی خاطر پندرہ برس ایک کمرے میں گزار دیے مگر اس پر کمرے کی حقیقت کھل گئی۔ اسی طرح انشائیہ "بیماری" میں مشہور ناول نگار البیر کامیو کے ناول "طاعون" کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"البیر کامیو" کے ناول "طاعون" میں جب اوراں شہر پر طاعون کا حملہ ہوتا ہے تو پہلی بار وہاں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آکر خالص انسانی سطح پر سوچتے ہیں ورنہ پہلے تو وہ اپنے معمولی شخصی مفادات کے گڑ سے چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوتے ہیں۔"(۲۸)

اس میں ناصر عباس نیر نے بیماری میں جو عام انسانی رویہ ہے کہ ہم سب کچھ چھوڑ کر پریشان حال بیٹھ جاتے ہیں جیسے کوئی ان ہونی ہو گئی اس میں بھی راہ مستقیم دکھائی ہے اور مختلف حوالوں سے بیماری کو خود شناسی کے مقام تک پہنچاتے ہوئے البیر کامیو کے ناول کی مثال پیش کی ہے کہ کس طرح بیماری نے مثبت صورتحال پیدا کی ہے۔اسی طرح اس انشائیے (بیماری) میں متعدد حوالے ادبی دنیا سے پیش کرتے ہیں مثال کہ طور پر بیماری کو کلاسیکی غزل کے رقیب سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بیماری پہلے پہل کلاسیکی غزل کے رقیب کی طرح لگتی ہے، جس کے خوف سے (زندگی کے) عاشق کی نیندیں حرام رہتی ہیں۔"[۲۹]

کلاسیکی اردو شاعری کی قدیم روایت میں خاص طور پر غزل کا موضوع عشق و محبت تھا اور محبت کا اہم کردار رقیب بھی تھا جسے مختلف نام دیے گئے اور غیر معمولی اہمیت دی گئی لیکن بیسویں صدی میں مابعد جدید دور کے بعد رقیب کے کردار میں کمی واقع ہوئی۔رقیب کے ہوتے ہوئے عاشق ہر وقت بے چین اور خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں اس کا محبوب رقیب کی باتوں میں نہ آ جائے اس کیفیت کا اظہار ناصر عباس نیر نے انسان کی بیماری کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بیماری بھی شروع شروع میں کلاسیکی غزل کے اس رقیب کی طرح لگتی ہے جس سے شروع شروع میں تو انسان کو فکر رہتی ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جائے گا اس کی نیندیں اڑی ہوتی ہیں ہر وقت ایک خوف سا طاری رہتا ہے مگر بعد میں اس خوف کی کیفیت سے وہ نکل آتا ہے اور جو اس پر گزرتا ہے اس کو تسلیم کرتے ہوئے اسی رضا میں خوشیاں تلاش کرنے لگتا ہے اور اس وقت وہ نہ صرف دنیا کی حقیقت کو پالیتا ہے بلکہ حقیقی مسرت کا قائل ہو جاتا ہے۔ناصر عباس نیر نہ صرف کلاسیکی شاعری بلکہ کلاسیکی شعرا کے مزاج سے بھی خوب واقف ہیں۔انشائیہ "خواہش" میں اپنے دوستوں کے سگریٹ کے ایک ہی برانڈ کی سگریٹ پینے کی استقامت کو کلاسیکی شعرا اور قوالوں کے خصائل سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ استقامت مزاج یا تو کلاسیکی شعرا میں ملتی ہے۔جو جس جگہ جا بیٹھتے تھے مے خانہ ہو جاتا تھا، یا پھر قوالوں کے ہاں جو ایک ایک مصرع کو اتنا بلواتے ہیں کہ ایک ایک حرف کے معنی لشکارامارنے لگتے ہیں۔"[۳۰]

کلاسیکی شعرا نے مے خانے کے مضامین کو تسلسل کے ساتھ رنگارنگ انداز سے پیش کیا ہے شعرا جہاں اکھٹے ہوتے وہیں شاعری کی محفل مے خانے کی سی صورت اختیار کر جاتی تھی۔ ناصر عباس نیر کلاسیکی شعرا کے مزاج کے ساتھ ساتھ ان کے قول و فعل سے بھی خوب واقف ہیں۔ انشائیہ "شام" میں جوش ملیح آبادی کے قول کو قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جوش نے کہا تھا اگر پیغمبر نا ہوتے تو ثبوتِ حق کے لیے صبح ہی کافی تھی۔"(۳۱)

اس طرح شعرا کی شاعری پر تنقید بھی ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں ملتی ہے جو ان کے علم و فہم کا جہاں پتہ دیتی ہے وہاں قاری کے سامنے ادب کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ "نئے موسموں کی ہوا" میں غالب کی شاعری پر تنقید اس انداز میں کرتے ہیں۔

> "نئے موسموں کی ہوائیں کوئی پیغام نہیں لاتیں۔ مرزا غالب کی شاعری کی طرح تازہ ہواؤں میں واضح پیغام کی بجائے ایسی" سرسراتی آہٹیں" ہوتی ہیں۔ جن سے حظ اٹھانے کے لیے تربیت یافتہ ذوقِ سماعت کی ضرورت ہے۔"(۳۲)

اردو شاعری میں مرزا غالب کو اعلیٰ پائے کا شاعر ہونے کا مقام حاصل ہے۔ انہوں نے شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی جس سے نئے نئے موضوعات کے سوتے پھوٹے اور انقلاب کی ایک نئی لہر دوڑی۔ انسانی معاملات پر غالب مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ انہوں نے جدید فلسفیانہ خیالات کو تخیل کی بلندی سے پیش کیا لیکن اس کو سمجھنا عام قاری کے بس میں نہیں۔ اسی معاملے پر ناصر عباس نیر نے تنقید کی ہے کہ ان کی شاعری سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ کہاں بات نئے موسموں کی ہوا پر کرتے نہایت خوبصورتی سے ناصر عباس نیر اس میں بھی غالب کی شاعری لے آئے۔

ناصر عباس نیر کی نہ صرف کلاسیکی اور عالمی ادب پر گہری نگاہ ہے بلکہ عالمی دنیا کے ادیبوں کے ذاتی حالات سے بھی خوب واقف ہیں۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ "بیماری" میں بیماری پر تذکرہ کرتے ہوئے سیموئیل بیکٹ کا بیماری کی حالت میں کیے گئے کارنامے کے بارے لکھتے ہیں۔

"مشہور ناول نویس سیموئیل بیکٹ کو جب معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی بیماری کی زد میں آ گیا ہے جو کسی بھی وقت موت پر منتج ہو سکتی ہے تو اس نے اپنے تین بہترین ناول لکھے۔"(۳۳)

سیموئیل بیکٹ آئر لینڈ کا مشہور مصنف ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر گزرا ہے۔ جس نے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں لکھا اور ادب کا نوبل انعام حاصل کیا۔ وہ زندگی کے آخری سالوں میں شدید بیمار رہنے لگا لیکن اس نے بیماری کی حالت میں بھی بہترین ناول لکھے اسی لیے ناصر عباس نیر "بیماری" میں لکھتے ہیں کہ انسان جب دیکھتا ہے اب کچھ نہیں بچا تو بہترین سے بہترین کام کرنا چاہتا ہے بیماری اس سے وہ کام بھی کروا دیتی ہے جو اس نے کبھی صحیح سلامت ہوتے ہوئے بھی نہ کیے ہوں گے۔ اسی طرح ادبی دنیا کے مشہور یونانی ہیرو ایڈی پس کا ذکر "خبر کی بھوک" میں ملتا ہے۔

"جس طرح ہر شخص ایڈی پس نہیں ہوتا تھا کہ سفنکس کے سوالوں کا جواب دے کر اتھینس کا بادشاہ بن سکے، اسی طرح خبر کا ہما بھی ہر واقعے کے سر پر نہیں بیٹھتا تھا۔"(۳۴)

ناصر عباس نیر نے انشائیوں میں جا بجا ادبی حوالے پیش کیے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ لسانی مباحث، زبان کے رموز و اوقاف کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ انشائیہ "کہنا سننا" میں ہے کہ غلط فہمی کا شکار فرد رموز و اقاف کا خیال رکھے بغیر بولے چلا جاتا ہے۔ ان کو زبان میں رموز و اقاف کی معنوعیت کا خوب انداز ہے۔ اس کے بغیر عبارت میں معنی کی تفہیم اور ابلاغ کی ترسیل اثر انداز ہوتی ہے۔ اردو میں جتنی اہمیت دیگر مسائل جن میں املا کی اصلاح اور معیار پر توجہ دینے کی ہے۔ اتنا ہی اہم اور ضروری مسئلہ رموز و اقاف کا ہے کیونکہ رموز و اقاف کا استعمال جملے کے صحیح معنی باہم پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر

نے انشائیوں میں ادبی دنیا سے حوالے مثالوں کے طور پر لیے ہیں جو کسی نا کسی صورت ان کے ادبی لگاؤ کا اظہار ہے۔ ان کے انشائیوں میں "پڑھنا اور مطالعہ کرنا" اور انشائیہ "قلم" ادب کے نمائندہ انشائیے ہیں جو قاری کا رجحان ادب سے سے جوڑتے ہیں اور پھر قاری نہ صرف پڑھتا ہے بلکہ مطالعہ بھی کرنے لگتا ہے جن میں سے ایک حیرت انگیز انکشافات کراتا ہے اور دوسرا اس کے منطقی نظارے کرواتا ہے۔ اسی طرح قلم تسخیر کا استعارہ ہے۔ جس کے پاس وہ طاقت ہے جو فرد سے وہ تحریر کراتی ہے جو روشن مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔ ان کے انشائیوں میں ان کی ادب سے دلچسپی کا رجحان ادبی دنیا سے پیش کیے گئے حوالے ہیں جو ان کے ادب سے لگاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہیں جو یقیناً ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

د۔ فلسفیانہ

ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا انداز فلسفیانہ ہے۔ وہ ہر پہلو اور ہر رخ کو بطور ایک فلسفی کے دیکھتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے فلسفیانہ سوالات کے جوابات بھی فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ فلسفہ ادب کی ایک فکری اصطلاح ہے جس کو انگریزی زبان میں Philosophy کہا جاتا ہے۔ یہ یونانی دو الفاظ "philo" اور "Sophia" کے ملاپ سے وجود میں آیا۔ امولیہ رنجن مہاپتر فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "لفظ (Philosophy)(فلسفہ) یونانی الفاظ "Philos" یعنی محبت اور "Sophia" یعنی دانش سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب محبت سے بنا۔"(۳۵)

پروفیسر انور جمال ادبی اصطلاحات میں فلسفے کو ایسے بیان کرتے ہیں جس کے بعد معنی اور مفہوم واضح ہو جاتے ہیں اس کے لیے افلاطون، ارسطو اور کانٹ جو بڑے فلاسفر گزرے ہیں ان کی تعریفوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "فلسفہ اشتیاق علم اور تلاش دانش کا نام ہے۔ فلسفے کو روح علوم کہنا بے جانہ ہو گا۔ افلاطون نے فلسفے کی تعریف یہ کی ہے۔ "اشیاء کی فطری ہئیت کے

> لازمی اور ابدی علم کا نام فلسفہ ہے۔" جبکہ ارسطو نے کہا ہے:" فلسفہ وہ علم ہے جس کا کام یہ دریافت کرنا ہے کہ وجود کی اصل ماہیئت یا وجود بالذات اپنی فطرت میں کیا ہے۔ نیز یہ کہ وجود کے اغراض و خواص اس کی اپنی فطری قدر کے لحاظ سے کیا ہیں۔"کانٹ نے سب سے زیادہ سادہ تعریف کی ہے۔" یہ انتقاد کا علم ہے" الغرض فلسفہ، غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کا عمل ہے۔"[۳۶]

اشیاء کی حقیقت کی بنیاد پر عقل کی روشنی میں غور کرنا اور متعین حدود میں رہتے ہوئے دیکھنا کے کسی چیز کا وجود کیوں ہے اور اس کے وجود کا مقصد کیا ہے یہ جاننے کا نام فلسفہ ہے۔ ایک عام ذہن اور فلسفی کے ذہن کا فرق ایک دوسرے سے مختلف ہے کسی بھی سوال کا جواب عام ذہن اس کے فوری اور قریبی معنی و مفہوم میں دے گا اس کے برعکس ایک فلسفی کا جواب بھی اور اس کا اٹھایا گیا سوال بھی اعلیٰ معنویت کا حامل ہو گا اس کے خیالات کا تعلق بیدار ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ گالینا کیریلنگو اور لیدیا کور شونووا" فلسفہ کیا ہے؟" میں فلسفے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " فلسفہ ان عام وہ مشترک ترین قوانین کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے جو کائنات کو، انسان کو اور کل انسانیت کو منضبط کرتے ہیں، فلسفہ انسان اور معاشرے کے، انسان اور فطرت کے اتحاد کی خود بنیادوں کے بارے جانکاری حاصل کرتا ہے۔"[۳۷]

دیگر مضامین کی طرح ادب بھی فلسفیانہ طرز فکر کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ناصر عباس نیر عام خیال کو بھی فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا ذہن ایک فلسفی کا ذہن ہے۔ فلسفیوں کے ہاں تجزیاتی سوچ کی جو فکر اور تجسس پایا جاتا ہے وہ ان کے انشائیوں میں بخوبی ملتا ہے۔ وہ منطقی انداز میں سوچتے ہیں اور کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ خود بھی غور کرتے ہیں اور قاری کا مزاج بھی غور کرنے کی طرف آمادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے فلسفیانہ گفتگو کو بھی عام قاری کے لیے آسان بنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے استفہامیہ انداز

اختیار کرتے ہوئے باریک سے باریک فلسفیانہ حقیقتیں بھی سادہ پیرائے میں بیان کی ہیں۔ ان کے انشائیے "چیونٹیاں" سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "آپ نے کبھی غور کیا، ایک دن میں ایک آدمی کتنی چیونٹیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے؟ میرے خیال میں دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں، جس کے پاؤں پر چیونٹیوں کی موت کے نشان ثبت نہ ہوں! فرض کیجیے، چیونٹیاں اس قابل ہو جائیں کہ وہ فوری سماعت کی عدالت قائم کریں اور اپنے قاتلوں کو کٹہرے میں طلب کریں تو شاید دنیا کے ہر شخص کے نام سمن جاری ہو جائیں، اور اگر چیونٹیاں اپنے مقتولین کا خوں بہا مانگیں تو شاید حضرت انسان کے تمام اثاثے کم پڑ جائیں۔ مگر سوچنے والی بات ہے کہ چیونٹیاں آخر اپنی ہم جنسوں کی اس عالمگیر قتل و غارت سے بے پروا کیوں ہیں؟ کیا اس لیے کہ وہ ناتواں ہیں؟"[۳۸]

چیونٹیاں کیڑے مکوڑوں میں قدرت کی ایسی ننھی مخلوق ہے۔ جو کہیں بھی پائی جاتی ہے اور بے شمار زندگی کے لمحوں سے بے خبر میلوں چلتی ہیں۔ ان میں سے کتنی ہی ایسی ہوتی جو ہمارے پیروں تلے آکر روندی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر فلسفیانہ سوچ کے دھاروں پر سفر کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ اس انشائیے میں نہ صرف انسان کی توجہ صلح جوئی کی طرف متوجہ کی گئی ہے بلکہ یہ بھی باور کروایا ہے کہ کس طرح دنیا کی تمام تر آسائشیں کم پر جائیں گی جب ہمیں آخرت میں ہمارے اعمال تھمائے جائیں گے۔ اس میں فلسفیانہ طرز فکر اختیار کرتے ہوئے۔ ناصر عباس نیر بالکل ایسے شخص کی طرح سوچتے جو کسی بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائے تو اسے فلسفیانہ سوچ اختیار کرتے ہوئے اس مشکل کا حل مل جاتا ہے۔ زندگی میں فلسفے کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ناصر عباس نیر نے انشائیہ "جھوٹ، سچ" میں فلسفی کی خوبی بیان کرتے ہوئے انہیں سر پھرے کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "چند سر پھرے فلسفیوں کو چھوڑ کر دنیا جھوٹ اور سچ کی قدر و قیمت ان کے اثر سے دیکھتی ہے۔"[۳۹]

اس انشائیے میں جھوٹ اور سچ کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ کیسے جھوٹ نے سچ کا لبادہ پہن رکھا ہے اور مسلسل دھول دینے میں کامیابی حاصل کیے ہوئے ہے جس کو سمجھنا عام ذہن کی پہنچ میں نہیں ہے۔ ان کے مطابق اگر جھوٹ نہ ہوتا تو دنیا امن کا گہوارہ ہوتی۔ لیکن دنیا جھوٹ کی زد میں پڑوان چڑھ رہی ہے اور کسی کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے؟ اگر اس کی پہچان میں کوئی اہم کردار ادا کر رہا ہے جو ان تمام مسائل کو سمجھ سکے تو وہ فلسفی ہیں۔ کائنات و حیات کے فلسفیانہ مباحث سمجھنے کے لیے انشائیہ "دائرہ دائرہ" میں لکھتے ہیں۔

"آغاز و انجام کے دقیق فلسفیانہ مباحث کو سمجھنا ہو تو اس ضمن میں دائرے کی خدمت مستعار لی جا سکتی ہیں دائرہ مسلسل اور کبھی نہ رکنے والے سفر کے جنون میں مبتلا زندگی کی طرح جانے کس منزل کی طرف بھاگ رہا ہے! اس کے گول وجود پر لاتعداد نقطے براجمان ہیں اور نقطے پر گمان ہوتا ہے کہ اس کے مجنونانہ سفر کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔ لیکن جوں ہی آگے بڑھتے ہیں، اس سے اگلا نقطہ بھی ہمیں اسی وہم میں ڈال دیتا ہے۔"(۴۰)

انسان نے جب سے آنکھ کھولی اپنے گرد و پیش کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن جب اس نے شعور کی بنیاد پر کسی نقطے کو سلجھانے کی کوشش کی تو فلسفی کہلایا۔ فلسفے کا دائرہ کار غور و فکر پر مبنی ہے۔ جس کا مقصد حقیقت کی تلاش ہے۔ مطالعہ حیات و کائنات کی حدیں بہت وسیع ہیں۔ فلسفی کے غور و فکر کا مرکزی نقطہ حیات اور کائنات ہے۔ ناصر عباس نیر نے ان دقیق مسائل کو سمجھنے کے لیے دائرے کی خدمت مستعار لینے کی ترغیب پیش کی ہے۔ جب فلسفی ان دقیق مسائل کا جواب حاصل کر لیتا ہے تو اس کا علم ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے لیکن یہ سوال ختم نہیں ہوتے بلکہ وہ ترقی کی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یوں فلسفیانہ سوال فلسفے کی حدود سے خارج ہو کر ایک نئے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور زندگی سے متعلق گہرے سوالات پھر انسان کو دنیا کے مصائب سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ انشائیہ "معنی" میں اس فعل کی ترجمانی کرتے ہوئے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں۔

"زندگی سے متعلق گہرے سوالات اکثر آدمی کو دنیا کی بڑی سے بڑی ترغیبات اور عظیم مصائب تک سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔"(۴۱)

ناصر عباس نیر نے جہاں یہ باور کروایا ہے کہ فلسفیانہ سوچ جہاں انسان پر فکر کی نئی راہیں کھولتی ہے اور وہ دنیا کی حقیقت کو پا کر اس کی رنگینیوں سے لطف اٹھانے کی بجائے اس کی اصل کو پہچان لیتا ہے وہاں ہر طرح کے مسائل سے گھبرانے کی بجائے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے۔ اس معاملے میں ان کے نظریات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ جس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"فاصلے اور قربت نے انسان کے فکری اعمال کو بھی بے تحاشا متاثر کیا ہے۔ فلاسفر بے کنار فاصلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ قریب کی اشیا کو حقیر جان کر دور افق کو معتبر سمجھتا ہے۔ فلسفیوں کے بارے میں لطیفہ بھی مشہور ہے کہ وہ آسمان کی پہنائیوں میں فکر و خیال کی پینگیں اڑاتے ہوئے اپنے پاؤں تلے موجود زمین کو بھول جاتے ہیں اور چلتے چلتے اچانک راستے کے کسی گڑھے میں جا گرتے ہیں۔۔۔ فلسفی دھند کو فریب نگاہ قرار دے کر ہمیشہ کشادہ آفاق میں کھویا رہتا ہے۔"(۴۲)

فلاسفر کائناتی مسائل کی حقیقت پانے میں اتنا گم ہو جاتا ہے کہ دور اندیشی سے کام لیتا ہے جبکہ کچھ سوالوں کا جواب اس کے بہت قریب ہوتا ہے اور دور اندیشی اس کو قریب کی چیزوں سے دور کر دیتی ہے۔ اس لیے اس اقتباس میں فلسفیوں پر گہرا طنز کرتے ہوئے یہ باور کرواتے ہیں کہ انسان کو فکر و سوچ کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے اس قدر اس میں محو ہونے سے خود کو بچائے رکھنا ہوتا ہے تاکہ وہ دور افق تک دیکھتے دیکھتے قریب کے گرداب میں نہ پھنس جائے کہ اس کے پیروں تلے زمین ہی نہ رہے۔ انہوں نے فلسفیانہ انداز میں چیزوں کو سائنسی اصولوں پر پرکھا ہے جیسے انشائیہ "فاصلے" میں لکھتے ہیں:

"ایٹم کتنا معمولی ذرہ ہے اس میں الیکٹرون نیوکلیس کے گرد فاصلے پر رہ
کر گھومتے ہیں اور جب یہ فاصلے ختم کیے جاتے ہیں تو ایٹم نہیں رہتا ایٹم بم
بن جاتا ہے۔ نوع انسانی کا سب سے بڑا دشمن!"[۴۳]

فلسفہ سوال اور تشکیک سے جنم لیتا ہے۔ زندگی کے عام اور روز مرہ معاملات کو ناصر عباس نیر نے فکری کی جس گہری سطح پر جا کر دیکھا، پرکھا اور نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ذہن کی پرتیں کھلتی ہیں اور ہم اپنی قریبی دنیا کو ایک الگ نظر سے دیکھنے سمجھنے اور سننے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ ان کے انشائیے زندگی کے باریک اور اہم ترین گوشوں سے متعلق سوچ و بچار کا حاصل ہے۔ جو انہوں نے فلسفیانہ انداز میں پیش کیے ہیں۔

دائرہ در دائرہ، کتنا قریب کتنا دور، میں سوچتا ہوں سو میں ہوں، کیا گزرے ہے!، سفر جاری رکھنا وغیرہ ان کے ایسے انشائیے ہیں جن کے عنوان ہی ان کی فلسفیانہ سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ دائرہ در دائرہ میں انہوں نے زندگی اور دائرے کے گول وجود کی تفہیم کی ہے۔ اس میں جس طرح سے وہ خود سوچتے ہیں اس طرح سوچنے پر ان کا قاری بھی مجبور ہو جاتا ہے یہ انشائیہ زندگی کے سفر کی بے معنویت کا استعارہ بن کر ابھرا ہے جس میں انسان ایک دائرے کے اندر سفر کرتا چلا جا رہا ہے۔ "کتنا قریب کتنا دور" یہ انشائیہ اشیا اور کائنات کے فاصلاتی نظام پر محیط ہے جس میں انہوں نے چیزوں کے باطن کو فاصلے کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی اپنی انفرادی پہچان کیا ہے؟ جبکہ سب کی موجودگی میں یہ پہچان بھی گم ہو جاتی ہے۔ انفرادیت تب ہی محسوس ہو سکتی ہے جب خالص اس کا جائزہ لیا جائے دوسروں کی موجودگی میں ایک چیز اپنی پہچان کھو دیتی ہے۔ اسی طرح ان کا انشائیہ "میں سوچتا ہوں سو میں ہوں" کائناتی تسلسل میں واقعات کو سوچ اور فکر کے دائروں میں مقیم کر کے پیش کیا ہے اور غور فکر کے اس سلسلے میں نہ صرف غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں بلکہ نہ غور کرنے کے نقصانات سے بھی آگاہ کراتے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ خیالات قاری کا ذہن کشادہ کرتے ہیں۔

ہ۔ تصوف

دنیا میں انسان کا مقصد کیا ہے؟اس مقصد کے حاصل کے لیے جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے وہ تصوف کی اصطلاح ہے یہ روحانیت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔اس کو قرآنی اصطلاح میں تزکیہ نفس کہا جاتا ہے یعنی نفس کو پاک کرنا۔اردو لغت میں تصوف کے معنی اس طرح سے ملتے ہیں: "وہ مسلک جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہو،تزکیہ نفس کا طریقہ کار "[۴۴] انسان اچھی اور بری صفات کا مجموعہ ہے یعنی اخلاق فضیلہ اور اخلاق رذیلہ اپنی ذات کو اخلاق رذیلہ سے پاک صاف کر لینا تصوف کہلاتا ہے۔ یعنی تکبر ، حسد، منافقت سے پاک خلوص،اور مروت کا رویہ رکھنا۔تصوف ایک طریقہ کار ہے جو صوفیا کرام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں اور دنیا کی رنگینیوں کا لطف اٹھانے کی بجائے اپنی زندگی کو نہایت سادہ کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں اور مسلسل عبادت میں مصروف رہنے سے اللہ کو پا لینے والی صلاحیتوں کے مالک بن جاتے ہیں جس سے ان میں درویشانہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔اس صورتحال کا تعلق تصوف سے ہے۔تصوف میں انسان اپنی ذات کی شناخت کھو دیتا ہے اور خود کو انسانوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔تصوف نہ صرف خود کو سنوارنے کا نام ہے بلکہ دوسروں سے بہتر رویے کا درس دیتا ہے ۔ جن میں یہ صفات پائی جائیں اور جو لوگ اپنی زندگی کو متصوفانہ انداز میں گزارنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں ان کے لیے بطور لقب صوفی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔صوفیا کی سب سے بڑی صفت عاجزی اور خدمت ہے۔پروفیسر سید صفی حیدر دانش تصوف کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "تصوف قلب انسانی کی ایک کیفیت کا نام ہے،وہ سر تا پا ذوق و وجدان ہے۔"[۴۵]

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں۔

> "یہ روحانیت کی اصطلاح ہے۔فرد کے روحانی تجربے کو "تصوف" کہتے ہیں۔تصوف کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ صاحبِ حال کے تجربے میں آتا ہے۔شریعت وہ عمرانی قوانین ہوتے ہیں جن کے تجربے میں

تمام انسان شامل ہیں لیکن صوفی کے حال میں دوسرا شخص شامل نہیں۔یہ فرد کی مکمل تنہائی کا تجربہ ہے جو نا قابلِ بیان ہے یعنی اس تجربے کا ابلاغ(Communication) نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابلاغ" عمرانی عمل ہے۔"(۴۶)

یہاں یہ واضح کرنا کہ تصوف کیا ہے ؟یہ اصطلاح کہاں سے آئی اور کس طرح استعمال ہوئی اور اس کہ متعلق مختلف نظریات و عقائد کیا ہیں ؟اور وہ کون سے مراحل ہیں جن کو طے کرنے سے انسان صوفی بنتا ہے۔میرا مقصد ان تمام سوالوں کے جواب تلاش کرنا نہیں بلکہ یہ مطالعہ کرنا کہ ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں جو تصوف کے حوالے سے انہوں نے اپنے تجربات بیان کیے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے ؟ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو متعدد انشائیوں میں تصوف کا رنگ اور تصوف کی جھلک دیکھائی دیتی ہے۔ناصر عباس نیر زندگی کے متنوع پہلوؤں کو فکری تجسس اور وجدانی ادراک کے ساتھ گرفت میں لا کر لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔تصوف کے راستے میں حائل مشکلات انسان کو نہ صرف اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔بلکہ انسان کو خدا سے بھی دور کر دیتی ہیں۔جبکہ تصوف کا مقصد یہ نہیں ہے۔اس کا مقصد تو روحانی طاقت کو حاصل کرنا اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا ہے تا کہ وہ خود کو پہچان سکے۔انسان کا اعلیٰ ترین مقام اس کی انفرادیت اور ضبط نفس ہے جو خودی کے وہ مراحل سر کرنے میں مدد کرتے ہیں جن کو سر کرنے کے بعد انسان دوسروں کو بھلائی اور فائدہ پہنچانے کے بارے سوچنے لگتا ہے۔ناصر عباس نیر انشائیے "فاصلے" میں لکھتے ہیں۔

"عشق اور تصوف میں عاشق اور صوفی کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ محبوب سے وصل کی آرزو میں ہر دم جلتا رہے مگر جب یہ مراد بھر آئے تو اپنی ہستی کو محبوب کی ہستی میں گم ہونے سے بچائے رکھے،اپنے اوصاف ذات کو ذاتِ محبوب پر تج نہ دے۔"(۴۷)

انسان کی انفرادی فلاح اور اجتماعی ترقی کا راز اسی میں ہے کہ وہ اپنے خالق سے اپنا رشتہ استوار رکھے اور خود کو اس کے تابع کر دے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو محبوب کی ہستی میں گم ہونے سے بچائے رکھے۔تصوف کا مطلب یہ نہیں کے انسان دنیا سے قطع تعلق ہو جائے اور حالات سے نظر پھیر لے بلکہ

دنیا میں رہتے ہوئے اللہ کی رضا کو پانا ناصر عباس نیر کے نزدیک تصوف ہے۔ انسان اپنی ذات سے نکل کر دوسرے کو فائدہ پہنچائے۔ صوفیا پر اکثر اعتراض کیا جاتا ہے کے وہ عشق کے جذبے میں گم عالم بے ہوشی کی کیفیت میں ایسے کلمات بھی ادا کر جاتے ہیں جو عالم ہوش میں ہونے پر سزا کا مرتکب ہو۔ اسی لیے ناصر عباس نیر کہتے ہیں کے انسان ہوش اس قدر نہ کھودے کہ اسے صحیح غلط کا احساس تک نہ رہے۔ اس کے لیے انہوں نے انسان کی عظمت کا تصور بھی پیش کیا ہے اور دنیا میں خدا کی بنائی ہوئی ہر چیز میں رمز اور حکمت کو بھی گردانہ ہے اور انسانی نافرمانیوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ انشائیہ "میرا ننھا استاد" میں لکھتے ہیں۔

> "قطرے میں دجلے کا نظارہ کرنا بھی معروفت کی کوئی صورت ہو گی مگر فطرت نے جو رنگا رنگ "قطرے" پیدا کیے ہیں تو اس میں بھی کوئی رمز اور حکمت تو ہے! انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کنویں کے بیل کی طرح آنکھیں مینچے ایک ہی مرکز کا طواف کیے جاتے ہیں اور یہ مرکز اپنی ذات ہے۔"[۴۸]

اس میں انہوں نے قطرے کو بطور استعار ننھے بچے کے لیے استعمال کیا ہے اور کہتے ہیں کہ ان قطروں کے وجود کی آخر رمز اور حکمت ہے جس کو انسان نہیں دیکھ پاتا اور وہ اپنے آپ میں گم رہتا ہے۔ دوسری طرف استعارے کے پیرائے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی ذات سے نکل کر دنیا کی بھلائی کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو خالص صوفیانہ رویہ ہے۔ تصوف کا راستہ اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں اس کے لیے مسلسل خود کے نفس پر قابو پانا اور مسلسل صبر و استقلال سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی ذات کے گرداب سے نکل کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ تصوف میں انسان مختلف حصوں میں بٹنے کی بجائے اپنی ذات کی پہچان کر لیتا ہے اور انسانوں کی بھلائی کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے۔ ناصر عباس نیر وجدانی شعور کو اس مہارت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے جہان معنی کھل جاتا ہے۔ جسے پا کر قاری عرفان کی منزلیں حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ تصوف کا مطلب کرامات یا راہبانیت نہیں ہے نہ ہی روحانی طاقت حاصل کرنا۔ بلکہ یہ وہ طاقت ہے جس کو حاصل کرنے کے بعد انسان میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انشائیہ "خاموشی" میں ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

"فی الاصل خاموشی ایک سنجیدہ کیفیت ہے۔جو انکشاف و عرفان کی عمودی پرواز کے لیے BASE فراہم کرتی ہے۔۔۔خاموشی کی بظاہر بنجر کھیتی سے عرفان و انکشاف کا جو پودا پھوٹتا ہے وہ،ایک نئے اظہار کا اعلامیہ ہے۔یوں خاموشی بیک وقت تخریبی اور تعمیری قوت ہے۔"(۴۹)

تلاش حق کی منازل طے کرنے کے لیے صوفیامراقبہ کی صورت اختیار کرتے ہیں جو مکمل خاموشی اور تنہائی کا تجربہ ہے جو انسان سے وہ منازل سر کرواتی ہیں جو کسی کو حاصل نہیں ہو پاتی۔ناصر عباس نیر نے معرفت کے حصول کے بعض طریقے اور ذرائع بھی بتائے ہیں۔ جس کے بعد انسان عام انسان سے صوفی کا مقام پالیتا ہے جس سے اس کا وجود منور ہو جاتا ہے جو دنیا اور آخرت کی بھلائی پر منتج ہے۔جو ناصر عباس نیر کے مطابق خود اپنی روح یا نفس کی گہرائیوں کے مشاہدے سے ہوتی ہے۔ جیسے صوفیا نے معرفت نفس،اور معرفت ذات کا نام بھی دیا ہے۔انشائیہ "کمرہ" میں ناصر عباس نیر بیان کرتے ہیں:

"کمرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے وہ خاص ماحول اور فضا مہیا کرتا ہے جو معارفتِ ذات و کائنات جاننے کے لیے اسی قدر ضروری ہیں، جس قدر نباتاتی زندگی کے لیے سورج کی حرارت!خالص جسمانی سطح کی مصروفیات روحانی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔"(۵۰)

تصوف میں انسان اپنی ذات سے نکل کر روحانی طاقت کو اس قدر بلند کرلیتا ہے کہ اس کو اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے اور وہ خود کو پہچان کر خدا کو پہچاننے کا قائل ہو جاتا ہے اور عرفان کی وہ منازل حاصل کرلیتا ہے جو عام دنیا کی رنگینیوں میں محو انسان تلاش نہیں کر پاتا۔اس کے لیے ناصر عباس نیر کہتے ہیں کے کمرہ وہ خاص ماحول مہیا کرتا ہے جو ان سرگرمیوں کے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

متصوفانہ رنگ ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں جابجاملتا ہے۔ناصر عباس نیر انشائیوں میں کسی نئی دنیا کو تخلیق نہیں کرتے بلکہ ان کا وجدان محض عرفان ذات تک ہے۔ کہ انسان جدید دور میں جن مسائل کا شکار

ہے جس میں تنہائی جس کو جان لیوا سمجھتا ہے اس کو وجدان اور عرفان ذات کی منازل حاصل کرنے کے کام لا سکتا ہے۔ جس سے وہ دنیا میں اپنے وجود کی شناسی کا قائل ہو گا خود کو مٹی کا پتلا سمجھنے کی بجائے ان اشیا کو تسخیر کرنے کا قائل ہو جاتا ہے جو اس کا بنیادی مقصد ہے۔ اور وہ جیسے جیسے مخلوق کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے اس کہ خود کے راستے بھی ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو دنیا سے بے نیازی ایک صوفی اختیار کرتا ہے وہ ہم تنہائی کی بوریت میں بروئے کار لا کر خود شناسی کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ ان کے انشائیے فرد کا رشتہ فطرت سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جس سے فرد خود شناسی کے عمل سے گزر کر وہ منازل حاصل کر لیتا ہے جو صوفی حضرات کو حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں "کمرہ" ایسا انشائیہ ہے جو مکمل تسخیر اور عرفان کے لیے وہ خاص ماحول فراہم کرتا ہے جو زندگی کا لازمی جز ہیں اور یہی ماحول صوفی کو بھی متصوفانہ منازل تک پہنچانے کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ گو کہ ناصر عباس نیر نے اس ماحول کو پڑھنے مطالعہ کرنے اور قلم کی طاقت سے تسخیر کرنے جیسے عناصر کی طرف موڑتے ہیں اور یہ تسخیر وہ ہے جو انسانوں کے لیے روشن صبح کا پیغام ہو اور انسانیت کے لیے بھلائی کا موجب ہو۔ جیسا کہ اوپر مثالوں سے واضح ہے کہ انہوں نے انشائیوں میں جابجا انسان کا رشتہ تصوف سے جوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے ہاں تصوف کا وہ وجود جو صوفیا کرام کے ہاں ہمیں ملتا ہے اس سے مختلف ہے جس میں ناصر عباس نیر قاری کو تصوف کی طرف مائل ہونے کی بظاہر دعوت نہیں دیتے بلکہ اس ماحول سے متعارف کرواتے ہیں جو صوفی اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں یہ ماحول تسخیر کائنات اور تسخیر ذات کے نئے روپ میں ملتا ہے۔ انہوں نے قاری پر علم و عرفان کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ جو ایسے عرفان کی بنیاد فراہم کرتا ہے جو پہلے صرف صوفیا تک محدود تھا۔

و۔ اخلاقیات

اخلاق کی جمع اخلاقیات ہے اس سے مراد اچھے اور برے کی تمیز ہے۔ یہ ایک رویے کا نام ہے جب انسان کسی سے اچھے طریقے سے ملتا یا بات کرتا اس سے عزت و احترام سے پیش آتا تو یہ رویہ اس کا با اخلاق ہونا ہے۔ یعنی انسان کا اچھا رویہ عادات و خصائل اخلاقیات کے زمرے میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد امین اپنی کتاب "اخلاقیات (ایک تعارف)" میں اخلاقیات کے بارے رقم طراز ہیں۔

"اخلاقیات انسانی کردار کا خیر وشر، صائب اور غیر صائب ہونے کے حوالے سے مطالعہ کرتی ہے۔"(۵۱)

نور الغات میں اخلاقیات کے معنی و مفہوم کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

"اخلاق (ع) خلق کی جمع ۔اچھی عادات۔ تہذیب مذکر اردو میں بیشتر بجائے واحد بولا جاتا ہے۔(۱) عادات و خصائل (۲) انسانیت، ملنساری، مروت، آؤ بھگت (۳) وہ علم جس میں تہذیب، نفس اور معاد و معاش وغیرہ سے بحث ہوتی ہے۔ اخلاق معاشرت، باہم ایک جگہ رہنے سہنے کے آداب"(۵۲)

اخلاقیات باہم رہنے سہنے، عزت و احترام سے پیش آنے کے طور طریقوں سے بحث کرتی ہے۔ دیکھا جائے تو ادب اخلاق کا منبع ہے لیکن ادب سے مراد یہ نہیں ہے کہ خطیبانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس میں تلقین و ہدایت سے کام لیا جائے بلکہ ادب میں ادیب صرف زندگی کے حقائق کو سامنے رکھ کر لکھتا ہے اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود اندازہ لگا سکیں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ جس طرح اخلاقیات کا کام خیر اور شر کے اوصاف کو سامنے لانا اور اچھے برے میں تمیز پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح ادب بھی معاشرے میں روشنی پھیلانے کے اسباب فراہم کرتا ہے اور معاشرے کی ان تبدیلیوں اور رویوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ جیسا کہ سلیم احمد ادب اور اخلاقیات پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ادب کا کام یہ نہیں ہے کہ بیان کرتا پھرے کہ جی ہاں سچ بولنا بڑی اچھی چیز ہے، بلکہ یہ اصول زندگی میں کس طرح بروئے کار آ رہا ہے، ان کو بیان کرنا ادب کا کام ہے۔"(۵۳)

ناصر عباس نیر کے ہاں ادب اور اخلاقیات کا سنگم ان کی تحریر کا خاص جوہر ہے۔ ان کا تخلیقی جوہر کسی بھی نوعیت کا کیوں نا ہو فکر و شعور کی ایسی سمت ضرور رکھتا ہے جو بنی نوع انسان کو بقاء کی جانب رواں رکھتا ہے۔ ناصر عباس نیر فرد اور معاشرے کے رشتے کو مضبوط امور مستحکم بنانے کے لیے فرد کی انفرادی اور اجتماعی

نشو نما کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ جھوٹ ،غیبت، منافقت، تکبر، حسد ایسے رذائل اخلاق ہیں جو معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتے ہیں اور اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کا فروغ ناصر عباس نیر کی تحریروں کا بنیادی مقصد ہے۔ ان اخلاقی تصورات کو بیان کرنے کے لیے ناصر عباس نیر نے ادبی فرض کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔ اکثر اوقات ہم دوسروں کو بے وقوف بنانے ان کی خوشامند کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی خود کو بڑا آدمی اور کوئی خود کو حقیر سمجھ لیتا ہے جو اخلاقی تقاضوں کے منافی ہے اور سماج میں بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ ہر انسان اپنی اصلاح کر لے تو سماج خود بخود مثالی نمونہ بن جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر انشائیے "چھوٹا، بڑا اور خالص آدمی" میں لکھتے ہیں:

"چھوٹا نہ بڑا، آدمی خالص بھی ہوتا ہے! خالص آدمی وہ ہے جو نہ چھوٹے آدمی کی طرح اپنی فطرت کو مسخ کرتا ہے نہ بڑے آدمی کی مانند فطرت کا استحصال کرتا ہے۔ وہ بس فطرت کی حفاظت کرتا ہے۔ چھوٹا آدمی نہ فہمی میں مارا جاتا ہے اور بڑا آدمی تیز فہمی کا مارا ہوا ہوتا ہے جبکہ خالص آدمی درست فہمی کی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے۔"[۵۴]

ناصر عباس نیر کے نزدیک اخلاقیات کا تقاضہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی انسان چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا بلکہ خالص بھی ہوتا ہے۔ اس صورت میں انفرادی اور معاشرتی تعلق میں ہم آہنگی پیدا ہو گی۔ ان کے عمومی اخلاقی تصورات کا مقصد بھی انسانیت کی خدمت ہے۔ وہ انسان کو نہ صرف اجتماعی صورت میں خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ انسان کی ذات شخصیت اور اس کی فطرت میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور فرد کو اس کی انفرادی حیثیت سے ہر قسم کی آزمائش سے گزار کر بہتر نتیجے سے فیض یاب ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے انسانی فطرت کے سبھی حقائق قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ناصر عباس نیر انشائیہ "سفر جاری رکھنا" میں لکھتے ہیں۔

"خود چراغ روشن کرنے کے لیے کبھی خون جگر جلانا پڑتا ہے، کبھی لہو رونا اور بعض و اوقات اپنے پورے وجود کو بھسم کرنا پڑتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ روشنی ہر جگہ روشنی ہے، مگر مجھے اصرار ہے کہ روشنی روشنی میں فرق ہے۔ دوسروں سے حاصل کی گئی روشنی، اپنے خون یا خون جگر

سے نکلنے والی روشنی اور اپنے پورے وجود کی راکھ سے پھوٹنے والی روشنی میں بہت فرق ہے۔نوعیت کا بھی اور درجے کا بھی!مستعار روشنی صرف راستہ دکھاتی ہے،خون جگر سے حاصل ہونے والی روشنی راستے پر چلنے کا اعتماد بخشتی ہے"(۵۵)

اس اقتباس میں ناصر عباس نیر وہ تمام حقائق سمیٹ کر لے آتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اعلیٰ شخصیت کا متقاضی بنتا ہے۔انسان میں محنت اور لگن کی دعوت دیتے ہوئے یہ باور کروایا ہے کہ انسان خود محنت مسلسل جدوجہد سے کوئی بھی مقام اور رتبہ حاصل کر سکتا ہے اس سے اس کو نہ صرف ذہنی سکون حاصل ہو گا بلکہ اعلیٰ اخلاق کی منازل بھی سر کر سکتا ہے۔اس کے لیے ناصر عباس نیر نے انسان کے خود سے حاصل کیے گئے مقام اور دوسروں کے سہارے سے حاصل کیے گئے مقام کا تقابل کرتے ہوئے یہ نتیجہ قاری پر چھوڑا ہے کہ اس نے کونسی راہ اختیار کرنی ہے۔انسان ناکام بھی ہوتا ہے زندگی میں بہت سی غلطیاں بھی کرتا ہے اور پھر ٹھوکریں بھی کھاتا ہے مگر مومن کی شان اسی میں ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرے اور یقین کامل رکھتے ہوئے اپنے اخلاق کو بہترین کر دے۔

ناصر عباس نیر نے آج کے جدید معاشرے کے وہ خطرات جو ہر دوسرے شخص کو لاحق ہیں جن میں غصہ، تعصب، نفرت اور دوسروں کو کم تر سمجھنا اور خود کو برتر سمجھنا جیسے مسائل پر سے بھی بخوبی پردہ اٹھایا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ کیسے انسان ان تمام معملات کا حصہ بن جاتا ہے اور اس سب سے اس کی شخصیت کس قدر متاثر ہوتی ہے۔"کتنا قریب کتنا دور" میں ناصر عباس نیر کہتے ہیں:

"غصہ اجنبیت، نفرت اور تعصب بھی تو دھند ہی ہیں جو آدمی کی شخصیت کی بلندی اور کشادگی کے آگے بھاری پردہ سا گرا دیتی اور نفرت اور تعصب خوب میک اپ کر کے آنکھیں دکھانے لگتے ہیں اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اپنی بلند قامتی کا رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔اسی طرح غصہ اور اجنبیت کا کہر چھا جانے سے آدمی کی شخصیت کا بلائی رخ

"چمکنے" بلکہ شعلے اگلنے لگتا ہے اور قریب کی چیزوں اور افراد کو جھلسا ڈالتا ہے۔"(۵۶)

غصہ ایک ایسا جذبہ ہے۔ جس کا مادہ ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے اور اس کے پس پردہ ایسے عوامل کار فرما ہیں جن کا ادراک انسانیت کے تحفظ کے خلاف ہے۔ ناصر عباس نیر ان جذبات کی احسن طریقے سے عکاسی کرتے ہوئے۔ اس نقطے کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کیسے یہ شخصیت کی بلندی اور کشادگی کے سامنے پردہ گرا دیتی ہے۔ انسان اس سے چھٹکارا حاصل کر کے صحت مند زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا غیر اخلاقی عمل ہے جس کو پیش کرنے کے لیے ناصر عباس نیر نے دور اور قریب کے فلسفیانہ مباحث کا احاطہ کرتے ہوئے اس اہم موضوع کو اس طرح سے پیش کر دیا کہ قاری کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ قریب اور دور کے فلسفیانہ مباحث میں اس غیر اخلاقی فعل جو انسانی شخصیت کی سالمیت کے لیے خطرناک ہے یہ کیسے زندگی کو بدلنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انہوں نے فرد کو زندگی بسر کرنے کے لیے ایک نئے زاویے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ناصر عباس نیر افکار کے موتیوں سے قاری کے دامن کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ اسی طرح انشائیے خواہش میں ایک گہری اخلاقی معنویت پیدا کرتے ہیں ہوئے اس نظریے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کے انسان دوسروں کو راہ مستقیم پر لانے کے چکروں میں خود یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔ ناصر عباس نیر انشائیہ "خواہش" میں خواہش کے متعلق لکھتے ہیں۔

"خواہش کہیں باہر نہیں، خون میں، رگوں میں اور ارد گرد کے ادراک میں رواں دواں ہے۔ سماج سدھار کے نام لیواؤں کو، جنھیں دنیا میں سارے فساد کی جڑ خواہش دِکھتی ہے،......پہلے خواہش کو مارنے کی اندھی خواہش کا سر قلم کرنا ہوگا مگر کون ہے جو اپنے اوپر پہلا پتھر آپ پھینکنے کی جرأت کرے۔"(۵۷)

اس اقتباس سے انسان کا ذہن نہ صرف متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک نئی سوچ بھی متعین ہوتی ہے۔ جو انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ جس کام کی برائی دوسرے میں نظر آ رہی ہے پہلے اس سے اپنے تعیں نمپٹنا ہو گا۔ انسان کی فطرت میں اخلاق کے عمدہ عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن ان کی تربیت کے ذریعے ان کو مزید سنوارا جا سکتا ہے۔ جس کی عمدہ مثالیں جابجا ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں ملتی ہیں۔

ان کے انشائیوں کا موضوع انسان اور انسانیت کی بقا ہے۔ طاقت ور انسان نے طاقت کے دم پر وسائل کو کس طرح سے استعمال کیا اور اس طاقت سے انسان اور انسانی اقدار کس طرح متاثر ہوتی ہیں۔ اس کا اظہار بخوبی کرتے ہیں۔ وہ فن برائے زندگی کے قائل ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جہاں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ وہ فن کو زندگی کے تابع سمجھتے ہیں جس کا اندازہ ان کے انشائیوں کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ معاشرتی ناہمواریاں اور طبقاتی امتیازات کو برداشت نہیں کرتے اور انہیں موضوع بناتے ہیں۔ ان کی تحریر سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی اخلاقی اقدار اور اپنی تہذیبی روایات کے ماننے اور چاہنے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے معاشرے کی ان سچائیوں کو اجاگر کر دیا ہے جو کسی نہ کسی طرح معاشرے کو آلودہ کیے ہوئے ہیں۔

موجودہ دور میں سماجی تبدیلیوں نے انسان کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ سماجی زندگی میں محبت اور مروت کے فقدان کا باعث اقتصادی ناہمواریاں اور طبقاتی شعور بھی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار متاثر ہوئی۔ لیکن ناصر عباس نیر نے انشائیوں میں ایسے گہرے تصور پیش کیے ہیں جن میں صبر و قناعت کی تلقین کے ساتھ ساتھ خوش کن زندگی کے تصور بھی شامل ہیں۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں انسانی محبت کا عالمگیر سبق بھی ملتا ہے اور کہیں رواداری کی تلقین کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اخلاقیات کے تناظر میں لکھا گیا ان کا انشائیہ "جھوٹ سچ" اہمیت کا حامل ہے۔ سچ ایک ایسی اخلاقی قدر ہے جو دیگر اچھی اقدار کو فروغ دیتا ہے اور سماج کو بنانے اور بگاڑنے میں اس قدر کا ہونا بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ کسی بھی چیز کی بنیاد سچائی ہے اور سماج میں سچائی کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دینا ہے۔ ناصر عباس نیر نے بطور انشائیہ نگار تمام انسانیت کو امن اور محبت کا پیغام دیتے ہوئے خودی کو اجاگر کرنے کی تلقین کی ہے۔ جس کا ہر قدم انسان کی بھلائی کے لیے گامزن ہے۔ ان کے تمام انشائیے ایسے اخلاقانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بن نہیں رہتا۔ اس

سے قاری کو زندگی بسر کرنے کے نئے راستے ملتے ہیں یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ یہ فرد کو رات میں صبح کی نوید، مشکلات میں آسانیوں کی نوید اور اندھیرے میں روشنی کا پیغام نو ہے۔ڈاکٹر سکندر حیات لکھتے ہیں:

"ان کے انشائیوں کے باطنی رموز پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے انشائیے ٹمٹماتے ہوئے ان جگنوؤں کی مانند ہیں جو گھپ اندھیری رات میں ٹمٹما کر غائب نہیں ہوتے بلکہ ان کی چمک چاندنی کا روپ دھار کر قاری کو اپنا سفیر بنا لیتی ہے۔"(۵۸)

انہوں نے بلاواسطہ اخلاقی عناصر انشائیے میں ایسے برتے ہیں کہ اس سے انسان کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔انہوں نے مشاہدات کو اس سلیقے سے پیش کیا ہے کہ وہ ایک مثبت سوچ کے عکاس بن گئے ہیں اور قاری کے ذہن کو بھی نہ صرف مثبت رویوں سے شناسائی کرواتے ہیں بلکہ ان کی یہ بات علم و حکمت کا پرچار ہے جو ایک طرح سے زندگی روشن کرتی ہے۔ان پر عمل پیرا ہو کر زندگی کے اثمار سے لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور مثبت معنی بھی کشید کیے جا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،چراغ آفریدم،بیکن بکس،ملتان،طبع دوم،۲۰۱۴ء،ص ۱۰۴

۲۔محمد حسن،اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۱۹۹۸ء،ص ۴۵

۳۔۔کفایت اردو لغت، کیفایت اکیڈمی اردو بازار، کراچی،۱۹۸۹ء،ص.۷۹ ۴۔۷۴۶

۴۔ابو الاعجاز حفیظ صدیقی،(مرتب)کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص ۱۸۱

۵۔خلیل صدیقی،زبان کیا ہے ؟،بیکن بکس گلگشت،ملتان،۲۰۰۱ء،ص ۷۲

۶۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،چراغ آفریدم،ص ۲۹

۷۔ایضاً،ص ۱۰۴

۸۔ایضاً،ص ۵۱

۹۔ایضاً،ص ۶۱

۱۰۔ایضاً،ص ۹۱

۱۱۔ایضاً،ص ۶۸

۱۲۔ایضاً،ص ۴۴

۱۳۔ایضاً،ص ۱۶

۱۴۔عنبرین شاکر جان،ڈاکٹر، ادب اور سیاست، مشمولہ بازیافت ۲۹، شعبۂ اردو،اورینٹل کالج،پنجاب یونیورسٹی،لاہور،جولائی تا دسمبر،۲۰۱۶ء،ص ۲۵۷

۱۵۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،چراغ آفریدم،ص۴۷

۱۶۔یوسف سرمست،ڈاکٹر،ادب نقد حیات، مکتبہ جامعہ دہلی لمیٹڈ، علی گڑھ،۱۹۹۳ء،ص۸۸

۱۷۔ شکیل الرّحمنٰ،ادب اور نفسیات (انتقادی مقالات)،اشاعت گھر،پٹنہ،۱۹۵۱ء،ص۵۲

۱۸۔ محمد حسن، معاصرہ ادب کے پیش رو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع نگر، نئی دہلی،۲۰۱۱ء،ص۱۵۴

۱۹۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب کلب روڈ،لاہور،۱۹۸۶ء،ص۲۷۶

۲۰۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،چراغ آفریدم،ص۸۴

۲۱۔ایضاً،ص۹۷

۲۲۔ایضاً،ص۲۲

۲۳۔ایضاً،ص۱۶

۲۴۔ایضاً،ص۱۰۵

۲۵۔صدف نقوی، گوہر ادب، مثال پبلشرز، فیصل آباد،۲۰۱۵ء،ص۲۱

۲۶۔عبد اللہ،سید،ڈاکٹر،اشارات تنقید،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۳ء،ص۲۳۶

۲۷۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،چراغ آفریدم،ص۱۳

۲۸۔ایضاً،ص۲۰

۲۹۔ایضاً،ص۲۰

۳۰۔ایضاً،ص۶۷

۳۱۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص ۲۳

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۷

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۳۵۔ امولیہ رنجن مہاپتر، فلسفہ مذاہب، مترجم یاسر جواد، لاہور فکشن، ہاؤس، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳

۳۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۳۷۔ گالینا کیریلنگو اور لیدیا کورشونووا، فلسفہ کیا ہے؟ دارالاشاعت ترقی، ماسکو، ص ۳۷

۳۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص ۱۲۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۷۶

۴۳۔ ایضاً ص ۵۵

۴۴۔ اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)، جلد پنجم، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۹

۴۵۔ صفی حیدر دانش، پروفیسر، تصوف اور اردو شاعری، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۲۵

۴۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۷۵

۴۷۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۵۶

۴۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۶۳

۴۹۔ ایضاً، ص۸۳

۵۰۔ ایضاً، ص۱۱

۵۱۔ محمد امین، ڈاکٹر، اخلاقیات (ایک تعارف)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۲۰۱۸ء، ص۹

۵۲۔ نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات، جلد اول، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص۲۶۷

۵۳۔ سلیم احمد، ادب اور اخلاقیات، مشمولہ، ادبی مذاکرے (مرتب) شیما مجید، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص۱۱۰

۵۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۱۳۰

۵۵۔ ایضاً، ص۱۱۷

۵۶۔ ایضاً، ص۷۵

۵۷۔ ایضاً، ص۶۸

۵۸۔ سکندر حیات، ڈاکٹر، ڈاکٹر ناصر عباس نیر بطور انشائیہ نگار، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، جلد،۸۷، شمارہ:۲ فروری۲۰۱۵ء، ص۴۳

باب سوم: "چراغ آفریدم" کا اسلوبی جائزہ

الف۔ شگفتگی

ب۔ اختصار

ج۔ انکشاف ذات

د۔ عدم تکمیل

ہ۔ غیر رسمی انداز

و۔ فطرت نگاری

ز۔ تنوع

ح۔ زبان و بیان

حوالہ جات

"چراغ آفریدم" کا اسلوبی جائزہ

ادب کی کسی بھی صنف سے تعلق رکھنے والی تخلیق اس میں فن پارے کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو اس میں جہاں فکر و خیال کی اہمیت تسلیم شدہ ہے وہیں اس کا انداز بیان اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ تخلیق کار کا موضوع جس میں وہ کسی مسئلے پر بحث کر رہا ہے وہ تو دوسرے کے مماثل ہو سکتا ہے لیکن دونوں کے ایک ہی بات کہنے کا انداز مختلف ہو گا مثلاً اگر میں منشیات کے موضوع پر مضمون لکھنا چاہوں اور آپ بھی اسی کو موضوع بنائیں اور ہم دونوں اس خیال کو پیش کریں کے منشیات کا استعمال صحت کے لیے خطرناک ہے یوں موضوع تو ایک جیسے ہو سکتے ہیں لیکن دونوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے مختلف ہو گا جو دونوں کی تحریر میں انفرادیت کا باعث ہو گا۔ ہر شخص کے بات کہنے کا انداز ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے ایک ہی بات کو کوئی اس قدر پیچیدگی سے بیان کرتا ہے کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور دوسرا کسی پیچیدہ بات کو بھی اس قدر جامع انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ باآسانی دوسروں کی سمجھ میں آ سکے یوں وہ بات اپنا گہرا اثر رکھتی ہے اس کے برعکس پیچیدہ بات اہمیت کی حامل بھی ہو گی تو اپنا اثر کھو دے گی۔ لہٰذا فکر و خیال کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کا انداز بیاں یعنی اسلوب جس میں الفاظ کا چناؤ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کسی بھی فن پارے کی بقا کا انحصار اس کے اسلوب بیان میں ہوتا ہے۔ اسلوبی مطالعہ کے سلسلے میں اگر اسلوبی کے معنی دیکھے جائیں تو پتہ چلتا ہے یہ اسلوب سے ہی نکلا ہے۔ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو ادب میں اندازِ بیان، طریقہ، طرز اوو روش وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہے اور انگریزی میں اس کو سٹائل (Style) کہا جاتا ہے۔ فرہنگ عامرہ میں اسلوب کے معنی اس طرح سے ہیں:

"اسلوب (اُس-لوب) طریقہ۔ طرز۔ روش۔ جمع: اسالیب۔"[1]

یہ اس کے لفظی معنی ہیں۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہئیت و صورت، یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے لیکن انتقادی تصانیف میں اکثر و بیشتر کلمات مستعملہ کے معانی متعین نہیں ہوتے، اور اسلوب کو محض انداز

نگارش، طرزِ بیان کہہ کر اس کلمے کی وہ تمام دلالتیں ظاہر نہیں کی جا سکتی جن کا اظہار مطلوب ہے۔"(۲)

اصطلاح میں اسلوب سے مراد کسی ادیب کا طرز تحریر ہے۔ لیکن سید عابد علی عابد کے مطابق انداز نگارش سے اس اصطلاح کے معنی صحیح سے متعین نہیں ہو پاتے انہوں نے اپنی کتاب "اسلوب" میں کسی بھی فن پارے کے اسلوب کے مطالعہ کے لیے ایک طویل بحث پیش کی ہے۔ اسی طرح ناقدین نے اس حوالے سے مختلف تعریفیں پیش کیں جن کے مطالعے سے اسلوب کے مفہوم واضح ہو جاتا ہے اسلوب فکر کے اظہار کا وہ طریقہ ہے جس میں شخصیت کا عکس، ماحول، موضوع اور زبان و ادب کے امتزاج سے فن پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں الفاظ کا چناؤ اور چنے ہوئے لفظوں کا بر محل استعمال اہمیت کا حامل ہے۔

مختصر یہ کہ کسی بھی ادیب کی تخلیقات کا تمام پہلوؤں سے تفصیلی جائزہ ہی اس کی شناسائی کا مکمل حق ادا کروا سکتا ہے۔ اس ضمن میں تخلیقات میں پوشیدہ فکری اور موضوعاتی پہلو جتنے اہم ہوں گے اتنا ہی اہم اس کا اسلوب ہو گا۔ اسلوب فنکار کے فنی امتیازات کہلاتے ہیں۔ معاشرے کے خارجی اور داخلی عناصر کا جائزہ لینے کے لیے فنکار جو راہ اختیار کرتا ہے یا اظہار کے لیے انداز اپناتا ہے، اس کے لیے الفاظ اور دلکش جملے ادب کے اصولوں پر مزین لے کر آتا ہے وہی بنیادی طور پر تحریر کی جان ہوتی ہے۔ ہر شخص کے بات کہنے کا انداز دوسرے سے جدا ہوتا ہے جو اس کی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ انشائیے میں انشائیہ نگار کی اپنی ذات اور علم و مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے انشائیہ نگار جتنا وسیع مطالعہ، تجربہ، مشاہدہ اور علم رکھتا ہو گا اتنا عمدہ اور اعلیٰ درجے کا انشائیہ ہو گا۔ ناصر عباس نیر کے انشائی مجموعے چراغ آفریدم کا اسلوبی جائزہ لیتے ہوئے انشائیے کے متعین کردہ اصول و ضوابط کے تحت ان انشائیوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ محققین سے اخذ شدہ نتائج، جن کا احاطہ باب اول میں کیا گیا ہے، سے انشائیے کی جو خصوصیات اور اصول سامنے آتے ہیں ان میں شگفتگی، انکشاف ذات، اختصار، عدم تکمیل، غیر رسمی انداز اور تنوع نمایاں ہیں۔ اب ہم ان خصوصیات کا ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے حوالے سے جائزہ پیش کریں گے۔

الف۔ شگفتگی

انشائیے کی سب سے اہم خوبی شگفتگی ہے۔ شگفتگی تحریر میں تازگی، دلچسپی اور خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ شگفتہ نثر کسی بھی ادیب کا خاص جوہر کہلاتا ہے جس سے نثر بوجھل ہونے کی بجائے قاری کی دلچسپی کا باعث شروع سے آخر تک رہتی ہے۔ انشائیے میں چونکے کسی ناول افسانے کی طرح باقاعدہ کہانی نہیں ہوتی جس کو پڑھنے کے لیے قاری بیتاب رہے اس لیے انشائیے میں شگفتگی یہ فریضہ انجام دیتی ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں کی زبان سادہ اور شگفتہ ہے جو کہ انشائیے کی پہچان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں ادبی اسلوب کے تمام ترلوازمات کا اہتمام بھی باخوبی ملتا ہے۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی بنیادی عنصر ہے۔ مختصر جملے اپنے اندر جامعیت رکھتے ہیں۔ یہی بات بڑے واضح انداز میں وزیر آغا نے ناصر عباس نیر کے انشائیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہی۔

> "آپ ناصر عباس نیر کے انشائیے پڑھیں تو معمولی چیزوں اور افعال میں ایک جہانِ معنی نظر آئے گا۔ صنف انشائیہ کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ان گری پڑی چیزوں کو فرشِ خاک سے اٹھا لیتی ہے جنھیں ہماری ادبی اشرافیہ نے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا تھا۔۔اس حوالے سے دیکھیں تو ناصر عباس نیر نے جو نہ صرف زندہ رہنے والے انشائیے تخلیق کیے ہیں بلکہ اس صنفِ ادب کے طریقِ کار کو برت کر اپنی تنقید کو بھی تخلیقی سطح تفویض کر دی ہے۔"[۳]

ان کے اسلوب میں رچا بسا طنز ہے جو کبھی کبھی سنجیدہ ہو جاتا ہے وگرنہ لطافت کے پیرائے میں پہلو دار بات سے آپ دلکش فضا قائم کرتے ہیں۔ آپ واقعات کو پر لطف بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں اس سلسلے میں ان کا نہ صرف مشاہدہ بہت عمیق ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ واقعات کے بیان میں ان کا ذہن چوکس رہتا ہے جو اسلوب میں فطری روانی اور شگفتگی کا باعث بنتا ہے۔ ان کے ہاں شگفتہ نثر کا بے ساختہ پن موجود ہے۔ تنقیدی اسلوب کے ساتھ ساتھ شگفتگی کے عناصر بغیر مزاح کے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کے انشائیوں کا آغاز بھی شگفتہ اسلوب میں ملتا ہے۔ جیسا کہ انشائیہ "چیونٹیاں" کے آغاز میں ہی لکھتے ہیں:

"ان دنوں میری فکر چیونٹیوں کے طواف میں مصروف ہے۔"(۴)

جیسے "نئے موسموں کی ہوا" میں درختوں کے پتے جھڑ جانے اور خالی ٹہنیوں کے رہ جانے کو اس شگفتگی سے بیان کیا ہے کہ وہ بے لباس عورت پر طنز محسوس ہوتا ہے۔

"ننگا پن صرف لباس والوں کی موجودگی ہی میں ننگا پن لگتا ہے!"(۵)

ان کے انشائیے سچے اور کھرے فرد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر زندگی کے ہر واقع اور ہر چیز پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کے موضوعات میں زندگی کا ہر گوشہ شامل ہے۔ ان کے طنزیہ اسلوب میں ظرافت اور شگفتگی ہے اس انداز میں ان کا قلم بے باقی سے چلتا ہے۔ ان کی گہری بصارت قاری کے ذہن پر ایسے نقش چھوڑتی ہے کہ ناصر عباس نیر کا زندگی سے متعلق جو فلسفہ ہے قاری اسی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ کسی کی بھی ذاتی سوچ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ناصر عباس نیر جس خوش اسلوبی سے قاری کے ذہن کو لے کر چلتے ہیں وہ انہیں کے دیکھائے ہوئے راستوں میں کھو جاتا ہے یوں قاری کی سوچ کا محور بھی کسی ایک چیز کی طرف مرتکب رہنے کی بجائے ہر سمت چلنے لگتا ہے۔

ان کے بیان کی بلند پروازی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے انشائیوں میں بیشتر مقامات پر فطرت اور موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے تخیل کے زور سے غیر مرئی حالت سے مرئی حالت میں لے آتے ہیں۔ اس طرح انشائیوں میں تحیر کی فضا قائم کرتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے

"سورج بوڑھا اور خون کی کمی کا شکار محسوس ہوا جو لاٹھی ٹیکتے ہوئے دن کے پہاڑ پر ہانپتے ہوئے چڑھ رہا تھا۔ ہوا کی کمر بھی نقاہت اور عمر کی زیادتی سے جھکی ہوئی تھی اور اس کے سانسوں میں عہد کہولت کی

مخصوص باس رس بس چکی تھی۔ درخت بھی نڈھال تھے اور اس پر بیٹھے
پرندے مسلسل جمائیاں لے رہے تھے۔"(۶)

یہ اقتباس "کائنات بوڑھی نہیں ہوتی" انشائیے سے لیا گیا ہے جس میں کائنات کا نقشہ کھینچتے ہوئے سورج اور ہوا کو مرئی حالت میں اس طرح پیش کیا ہے جیسے سورج کوئی ضعیف عمر ہو جس میں خون کی کمی اور کمزوری کے باعث اس نے لاٹھی کا سہارا لے رکھا ہو اور پہاڑوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو اور ہوا بھی اسی طرح سورج کے ساتھ بڑھاپے کی حالت میں ہے۔ اس کے ساتھ کے درختوں کا نڈھال ہونا اور پرندوں کا جمائیاں لینا انشائیے میں تخیلی فضا اور شگفتگی کے عناصر کو نمایاں کرتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ "تنہائی" میں تنہائی کی کیفیت بھی اس مجسم کاری سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں تنہائی مجھے اپنے لمبے ناخنوں سے نوچنے لگی۔ اسی طرح ان کے اسلوب کی اس خوبی کو ان کے دیگر انشائیوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جیسے انشائیہ معنی میں اس کی مثالیں موجود ہیں اس میں خیال کو مرئی صورت میں لاتے ہوئے کہتے ہیں خیال کا جسم جلنے لگا۔ اسی طرح معنی کے بارے ان کی رائے ہے کہ یہ ایک زندہ سانس لیتا ہوا تجربہ ہے۔ ذوالفقار احسن ان کے اس انداز کے بارے رائے قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ناصر عباس نیر اپنے انشائیوں میں غیر مرئی چیزوں کو تجسیم نگاری کے ذریعے انتہائی دلکش بنانے کی غیر شعوری سعی بھی کرتے ہیں۔ جس سے انشائیوں کی دلکشی مزید بڑھ جاتی ہے۔ قاری کو یہ چیز بہت بھلی لگنے لگتی ہے۔ وہ غیر مرئی چیزوں کو تجسیم Personification کرنے کے فن سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں میں اکثر غیر مرئی چیزوں کو جسم عطا کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔"(۷)

انہوں نے سادہ، عام فہم اور روز مرہ استعمال کی زبان سے نئے نئے خیالات کا اظہار کیا ہے جسے قاری شوق سے پڑھنا پسند کرتا ہے ان کی زبان کی شگفتگی انشائیوں کو دلچسپی سے بھرپور کر دیتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں ہمیں پرانی داستانوں کے کرداروں کا بھی ذکر ملتا ہے جیسے قیدو کھوجی، شیخ چلی، ہیر رانجھا اور شیریں فرہاد جیسی تلمیحات بھی ان کے انشائیوں میں شگفتگی کی فضا پیدا کرتی ہیں۔ اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں وہ کوئی

وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو پڑھنے والے کو گراں نہیں گزرتا بلکہ شگفتگی کی بدولت قاری ان کے تجربات و خیالات بڑے غور سے پڑھتا ہے اور خود پر ان کی باتوں کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔

ب۔ ایجاز و اختصار

ایجاز و اختصار انشائیے کی سب سے اہم خوبی ہے اس سے مراد تحریر کو چھوٹا کرنا، تلخیص کرنا، مختصر کرنا اور خلاصہ کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ انشائیہ چونکہ مختصر ہوتا ہے اس لیے اس میں موضوع کی جزئیات کی بجائے اختصار کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت ذہانت کے ساتھ جامع انداز میں تحریر میں کوئی بھی پہلو سرسری سا بیان کرتے ہوئے گزار دیا جاتا ہے جس میں بات بھی ہو جائے اور پتہ بھی نہ چلے کے چلتے چلتے مصنف نے کتنے گہرے خیال اور وضاحت طلب بات کو مختصر انداز میں پیش کر دیا۔ پروفیسر انور جمال " ایجاز " کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "کسی موضوع (Content) کو کم سے کم ممکنہ حرفوں میں ادا کرنا ایجاز کہلاتا ہے۔ تجربے کا سیدھا سادہ As IT IS اظہار و بیان تو ہے، فنی بیان نہیں۔ فنی اور تخلیقی اظہار اپنے اندر رمز و ایماء اور کنایہ و علامت کی وہ لا فانی قوت رکھتا ہے جو کلام کو قدری ترفع بخشنے کے علاوہ بلاغت کی دولت بھی عطا کرتا ہے۔۔۔ کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی بات بیان کرنا "ایجاز" ہے۔ یہی حسنِ کلام ہے۔"[۸]

مختصر انداز میں جامع اور پر اثر بات کہنا بھی ایک فن ہے جو ہر کسی کا جوہر نہیں۔ اختصار سے ہر گز یہ مراد نہیں کے کسی بھی حوالے سے بات ہو رہی ہو تو اس کا ذکر سطحی سا کر کے چھوڑ دیا جائے اور بات پند و نصائح کا ملغوب بن جائے ۔ بلکہ اختصار سے مراد جامعیت ہے۔ جس سے تحریر میں پر اسراریت پیدا ہو۔ انشائیے کے اختصار کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے بنیادی بات یہی پیش نظر رہتی ہے کہ تحریر کی ضخامت اتنی ہی ہو کہ جو کسی ایک تاثر کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ کام یقیناً سہل نہیں۔ کسی انشائیے میں بہت سے موضوعات یا تفاصیل آسکتی ہیں۔ جو انشائیے میں تجربات کو بیان کرنے کے لیے ضروری ہوں گی، لیکن یہ

انشائیہ نگار کے کمال فن کی آزمائش ہے کہ وہ سب باتوں کو اس طرح ایک دائرے میں رکھے کہ کم سے کم وقت میں وہ تاثر پیدا کر کے دکھائے جس کے لیے وہ یہ کاوش کر رہا ہے۔

ناصر عباس نیر نے انشایئے کی اس خوبی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے تجربات اور نظریات کو طویل بیانات سے گریز کرتے ہوئے اس طرح مختصر انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کا انشایئے کے حوالے سے اسلوب نکھر کر سامنے آ گیا۔ ناصر عباس نیر نے طویل موضوعات کو جس طرح کوزے میں بند کیا ہے اس سے ان کے انداز میں جامعیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے اسلوب کو مد نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیں تو انہوں نے کہیں طویل اور کہیں انتہائی مختصر جملوں کے سہارے ایک مکمل بات جامع انداز میں بیان کی ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات ایسے ہیں جن پر مباحث ہو سکتے ہیں لیکن انہوں نے انشایئے کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بڑے احسن انداز میں ان بحثوں کو سمیٹا ہے۔ ان کے تجربات اس قدر وسیع معلوم ہوتے ہیں جن کی وضاحت انشایئے کی جامعیت کو متاثر کر سکتی ہے۔ انہوں نے مختصر جملوں میں ایسے خیالات پیش کیے ہیں جو قاری کی سوچ کے محور کو بلند کرتی ہے۔ ان کے مختصر جملوں میں گہری معنویت ہے۔

انشائیہ "خبر کی بھوک" میں انہوں نے بڑے جامع اانداز میں انسان کی بے حسی اور خود پرستی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> "آدمی خبر کا بھوکا ہے۔ شکم کی بھوک نے گندم اگائی تو خبر کی بھوک نے صحافی نام کی مخلوق کو جنم دیا۔ جس طرح گندم ذخیرہ اندوزوں اور سرمایہ داروں کے ہتھے چڑھ گئی، اسی طرح خبر پر اخبار، ٹی وی، انٹرنیٹ نے قبضہ جما لیا۔ خبر اور شکم کی بھوک نے ایک جیسی تقدیر پائی۔ گندم اور خبر کی فراوانی کے باوجود، دونوں کی بھوک بدستور موجود ہے۔ فراوانی حجاب ہے اور ہر حجاب ایک معما ہے۔"[۹]

انہوں نے خیالات و تجربات کی وضاحت کے لیے جملوں کی طوالت کا سہارا نہیں لیا بلکہ مختصر جملوں کا استعمال کر کے اپنی بات کو نہایت آسانی کے ساتھ قاری تک پہنچایا ہے۔ ان کے جملے بظاہر سادہ ہیں لیکن ان

میں گہرے مفاہیم چھپے ہوتے ہیں۔ ان کا فن بڑی سے بڑی بات ایک ہی مختصر سے جملے میں ایسے بات کہنے کا ہے کہ وہ گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ ان کے اس اسلوب کی چند مثالیں دیکھیے۔

"چھوٹا نہ بڑا آدمی خالص بھی ہوتا ہے۔"(۱۰)

اس مختصر جملے میں اس قدر پر اسراریت ہے کہ انسان کی سوچ کا زاویہ بالکل بدل جاتا ہے وہ دنیا کے چھوٹے اور بڑے آدمی کی تفریق سے آزاد ہو کر خالص انسان کو دیکھتا ہے۔

"فاصلے حسن کا احساس پیدا کرتے اور محبت کے جذبات کو بیدار کرتے ہیں۔"(۱۱)

"زندگی بغیر کسی منزل کے واضح تصور کے ایک صبر آزما سفر طے کر رہی ہے۔"(۱۲)

ان کے انداز بیان کی خوبی ہے کہ وہ تنقید بھی براہ راست کرنے کی بجائے ڈھکے چھپے انداز میں کرتے ہیں۔ جیسا کہ "نئے موسموں کی ہوا" میں ذکر تو خزاں کے موسم میں درختوں کی حالت کا ہے کہ کیسے ان کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ مگر اس تعلق میں طنز معاشرے کی ناہمواریوں پر کرتے ہیں۔ جو یورپی تہذیب سے اخز ہو رہا ہے۔ ان کے ہاں وضاحتی انداز پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اختصار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں اپنے ہر موقف کو ساتھ کے ساتھ واضح بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ وضاحتی انداز خود اختصار کا نمائندہ ہے۔

ج۔ انکشاف ذات

انشائیے میں انکشاف ذات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اظہارِ ذات کا رجحان مغربی انشائیوں میں اس قدر حاوی رہا کہ انشائیے کو Personal Essay کا نام دے دیا گیا۔ انکشاف ذات انشائیے کی سب سے اہم خوبی ہے "انشائیہ" انشائیہ نگار کی ذات کا عکس ہوتا ہے کیونکہ انشائیہ نگار اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے انفرادی سوچ کا اظہار انشائیے میں کرتا ہے۔ اس سے ایک فردی ذہن اور انسان کے اندر کی سوچ سامنے آتی ہے کیونکہ انشائیہ نگار اپنے خیالات کو بیان کرتا ہے اس سے اس کے ذاتی رجحانات کھل کر سامنے آتے ہیں۔

لیکن اس سے مراد یہ ہر گز نہیں کہ یہ فرد کی نجی زندگی اس کے معملات کا اظہار ہو بلکہ انشایئے میں انشائیہ نگار اپنی ذات کے حوالے سے زندگی کو مختلف نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ محمد اسد اللہ انشائیہ میں انکشاف ذات اور منفرد نقطہ نظر پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انشایئے میں اظہار ذات کا عمل زندگی میں پیش آنے والے اظہارِ ذات سے مشابہ ہے۔ یوں تو ہماری زندگی بذاتِ خود ایک انشائیہ ہے مثلاً ایجاز واختصار، جامعیت، عدم تکمیلیت، اسلوب کی انفرادیت، بے ترتیبی میں ترتیب کی تلاش، ندرت اور اظہار ذات۔ زندگی سراسر اظہار ذات ہے البتہ انشائیہ میں اس کی نوعیت فنی ہے لیکن طریقہ کار وہی ہے جو زندگی میں پایا جاتا ہے۔"[۱۴]

انشائیہ کا اندازِ بیان ایسا ہوتا ہے کہ حوالے کے طور پر مصنف کی ذات پیش پیش ہوتی ہے۔ انکشاف ذات کے ذریعے انشایئے میں فنی رنگینی پیدا ہوتی ہے جس سے انشائیہ نگار کے طرز تحریر اور صلاحیت کا باخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ انشائیہ لکھنے والے کی تخلیقی صلاحتوں کا عکاس ہوتا ہے اس لیے اس میں اس کی ذات کے تمام پہلو منور ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح سے انشایئے میں ایک قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے۔

انشائیہ نگار انشایئے میں اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ کامیاب انشائیہ نگار وہی کہلاتا ہے جو اپنے ذاتی تجربات سے نہ صرف قارئین کو آگاہ کرتا ہے بلکہ اپنے تجربات میں شریک بھی کرلیتا ہے۔ ناصر عباس نیر انشایئے کے اس پہلو کو باخوبی نبھاتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سید نصیر الدین احمد لکھتے ہیں۔

> "یہ صنف ادب اپنے اندر بڑی وسعتیں رکھتی ہے۔ اس میں ہر موضوع پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔۔۔ اس میں ذہن کی رو کو بڑی عمدگی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں شخصی تاثرات دلی جذبات ذہن اور فکر کی جولائیاں، احساسات کی بوقلمونی، غرض مختلف شخصی ارتسامات کو

> پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اس میں کسی خاص تسلسل ربط کی پابندی بھی ضروری نہیں ہوا کرتی بلکہ ذہن کی رو شخصی احساسات جو بھی راہ سمجھاتے ہیں، انشائیہ نگار کا قلم اس راہ پر چلنے لگتا ہے۔"(۱۴)

ناصر عباس نیر ایک زندہ دل اور خوشیاں بکھیرنے والے شخص ہیں۔ ان کے انشائیوں میں یہی فطری رنگ جھلک دکھا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے فن کی بدولت داخلی اور خارجی تجربات کو بیرونی دنیا کی واردات بنا دیا۔ موضوع بھی اسلوب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں کے اعلیٰ موضوعات ان کے اسلوب میں پختگی کا سبب بنتے ہیں۔ انہوں نے دیگر ادبیات عالم کا مطالعہ بغور کر رکھا ہے جس کا جائزہ ادبی موضوعات میں لیا گیا ہے۔ یہ رنگ ان کے انشائیوں میں ان کی ذاتی دلچسپی اور رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں "کمرہ"، "پڑھنا اور مطالعہ کرنا" اور "قلم" ایسے انشائیے ہیں جو ان کے ادبی لگاؤ کی بخوبی عکاسی کرتے ہیں۔ جیسا کہ سید صفی مرتضیٰ کی کتاب اردو انشائیہ جس میں وہ انشائیے اور مضمون میں فرق نہیں رکھتے جس کی بڑی وجہ کتاب کے سن اشاعت سے واضح ہے کہ انشائیے کی اصطلاح بطور صنف ادب باقاعدہ انشائیہ ۱۹۶۱ء کے بعد سے استعمال ہوئی ہے اس سے پہلے مضمون اور انشائیے میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا اس کتاب کے دیباچے میں انشائیے کی اس خوبی سے متعلق لکھتے ہیں۔

> "مضامین کے عنوانات کو دیکھیے تو اس سے مضمون نگار کی پسند اور ناپسندیدگی محبت اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔"(۱۵)

اس بیان کی روشنی میں انہوں نے مثالیں بھی دیں ہیں جیسے سرسید کے مضمون "اپنی مدد آپ" کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے ان کا کوئی سہارا نہیں تھا اس لیے انہوں نے اپنی ذاتی سوجھ بوجھ کے تحت زندگی گزاری جو اپنی مدد آپ کا نمونہ ہے اسی طرح ان کے مضامین میں انگریزوں کی تعریفیں اور جملے ان کے مغربیت کی طرف رجحان کی عکاسی تھی۔

بالکل اسی طرح ناصر عباس نیر کے انشائیے ان کی ذاتی دلچسپیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے انشائیے عام آدمی کا عکس پیش کرتے اور وہ خود بھی عام آدمی کے معاشرتی شعور کو جگاتے ہیں۔ یہ ان کی ذات کا بنیادی عنصر

ہے کے وہ شہرت کی ریل پیل نہیں کرتے بلکہ خالص انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ڈاکٹر سکندر حیات ان کی اس صفت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"بڑی شخصیات، اکثر دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ انسانی صفات سے محروم ہوتی ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی مقبولیت ان کے ادبی و علمی کارناموں پر دال ہے لیکن میں نے ہمیشہ ان کی ذات میں ایک اچھے انسان کو ہنستے چہکتے دیکھا ہے۔ بڑائی یہی تو ہے کہ آپ کے اندر کوئی بناوٹی رنگ نہ ہو آپ خالص اور سچے رویوں سے زندگی بسر کرتے رہیں۔"[۱۶]

ان کی ذات کی یہ خوبی ان کے متعدد انشائیوں میں ملتی ہے۔انشائیہ "چھوٹا بڑا اور خالص آدمی" ان کی اس خوبی کا مکمل عکاس ہے۔انہوں نے سماجی ناہمواریوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ انہیں معاشرتی عدم مساوات، جھوٹ، منافقت اور بڑے پن کے اسرار و رموز سے چڑ ہے۔ اس کے بر عکس فطری حسن کے دلدادہ ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ان کی شخصیت کے تمام بنیادی عناصر شامل ہو گئے ہیں جن میں سے کچھ کا شعوری اور کچھ کا لاشعوری طور پر اظہار ہو رہا ہے۔ان کو فطرت اور کتاب سے خاصی محبت ہے جس کا باقاعدہ اظہار ہمیں انشائیہ "کتنا دور کتنا قریب میں بھی ملتا ہے۔

"میں کالج کے ایک بڑے گیسٹ ہاؤس میں تنہا رہتا ہوں اور طبعاً زیادہ سوشل بھی نہیں ہوں،اس لیے کالج اوقات کے بعد یا تو کتابوں سے مکالمہ کرتا ہوں، دور رہنے والے دوستوں کو خط لکھتا ہوں یا پھر باہر کے مناظر سے علیک سلیک میں وقت گزارتا ہوں۔"[۱۷]

اس اقتباس میں ایسا لگتا ہے جیسے ناصر عباس نیر کی ذات اس میں مکمل سمٹ آئی ہے۔ ان کے متعدد انشائیوں میں ان کی کتاب دوستی کی مثالیں موجود ہیں جن سے یہ تاثر ملتا کہ ناصر عباس نیر کی زندگی میں کتاب کے سوا کچھ نہیں۔ کتاب کے ساتھ ساتھ دوسری چاہت ان کا فطرت سے لگاؤ ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ کتاب اور فطرت کا مطالعہ ہی ان کی زندگی ہے۔ ناصر عباس نیر بڑے زندہ دل انسان ہیں باوجود اس کے کہ

وہ ایک محقق اور نقاد ہیں عمومی طور پر ایسی شخصیت رکھنے والے لوگ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہوتے ہیں مگر وہ بڑے خوش طبع اور انتہائی شگفتہ طبعیت کے مالک ہیں ان کے انشائیے ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں اور فرد کو تعلیم حاصل کرنے، سوچنے کی دعوت دینے، اچھے برے حالات کا سامنا کرنے، تنہائی، بوریت، بیماری جیسے مسائل کا سامنا کرنے کی ہمت قاری کی سوچ میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ان سب کے بیان سے ناصر عباس نیر کی اپنی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے جو ان کے انشائیوں اور حقیقی زندگی کے اسرار میں کوئی فرق نہیں رکھتی جس کی بنا پر ان کے انشائیے ان کی آپ بیتی کا روپ بھی اختیار کرنے لگتے ہیں چونکہ انکشاف ذات انشائیے کا خاص وصف ہے جس پر انشائیے کی بنیاد کھری کی جاسکتی ہے اس حوالے سے ان کی ذات ایک رہبر کی ذات کے طور پر سامنے آتی ہے۔ان کی ذات کے مختلف پہلو تقریباً ہر انشائیے میں بکھیرے ہوئے ہیں جن سے قاری بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ان کے انشائیوں میں ان کی ذات کے مہذب ہونے اور خود شناسی کا جذبہ عیاں ہوتا ہے۔ اس وقت جب عام انسان تنہا پریشان بور اور خود کو ہارا ہوا تصور کرنے لگتا ہے ناصر عباس نیر ایسے لمحات میں زندگی کا اصل مزہ اور زندگی کے عظیم مقاصد کو پالینے میں گم ہوتے ہیں۔وہ نہ صرف اپنی ذات میں جھانکتے ہیں بلکہ قاری میں اس جذبے کو ابھارتے ہیں۔ یہ اسلوب ان کی ذہنی و روحانی نشو نما کے نتیجے میں بننے والی شخصیت کا عکس ہے۔

د۔عدم تکمیل، ادھورا پن

انشائیہ میں عدم تکمیل بھی انشائیہ کی بڑی خصوصیت ہے۔عدم تکمیل سے مراد نامکمل ہونا ہے۔اس کی پہچان جو اس کو دوسری اصناف یا پھر مضمون سے جو بات الگ کرتی ہے وہ انشائیے کا نامکمل ہونا ہے۔انشائیہ غیر سنجیدہ نثر کے زمرے میں آتی ہے۔ تحریر کا نامکمل ہونا یا اس کا ادھورا ہونا کہنا درست نہیں ہوگا بلکہ اس کی تحریر بیک وقت مختلف خیالات لیے ہوتی ہے چونکہ انشائیہ نگار ایک تسلسل قائم کیے بغیر ذہن میں جو کچھ آتا ہے لکھتا چلا جاتا ہے جس کے باعث ایک ہی بات کے کہی پہلو نکل آتے ہیں ضروری نہیں اس کہ لیے پہلی بات کو مکمل کیا جائے۔اس انداز بیان کو عدم تکمیل کہتے ہیں۔لیکن عدم تکمیل سے مراد یہ نہیں کہ جس موضوع پر بات شروع کی گئی تھی وہ ہو ہی نا بلکہ اگر ایک موضوع کے متعلق انشائیہ نگار انشائیہ لکھتا ہے تو اپنی ذہنی کیفیات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے مگر اس دوران اپنے تجربات و مشاہدات کے بیان کے ساتھ موضوع کے حوالے سے

مختلف آرا پیش کی جاتی ہیں اور جہاں انشائیہ نگار کے خیالات اس کا قلم روک دیں وہ وہیں اسے ختم کر سکتا ہے۔یوں عدم تکمیل کا احساس پیدا ہوتا ہے۔انشائیہ نگار چونکہ ذاتی خیالات ،سوچ اور فکر بتارہا ہوتا ہے اور انسانی دماغ بیک وقت کئی باتیں ذہن میں لیے ہوتا ہے اسی طرح انشائیہ نگار کے ذہن میں بھی بیک وقت ڈھیروں خیالات جنم لیتے رہتے ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے دلائل اور حقائق کی تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ایک موضوع کو چھوڑ دوسرے موضوع پر بات شروع کر دی جاتی ہے۔جس کی وجہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے جس کو انشایئے کی خوبی سمجھا جاتا ہے اور انشایئے کی اصطلاح میں اس کو عدم تکمیل کہا جاتا ہے۔مختصر یہ کہ یہ انشایئے کا ایک نمایاں پہلو ہے جس میں انشائیہ نگار واضح طور پر بات اختتام پذیر نہیں کرتا بلکہ خیالات کی رو جہاں ساتھ چھوڑتی ہے وہی پر قلم بھی انشایئے کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔انشائیہ "خبر کی بھوک" سے اقتباس دیکھیے۔

> "آدمی اپنی تضحیک پر احتجاج کر سکتا ہے مگر خواب کی تضحیک پر تو بس ایک لمبی چپ ہی اختیار کی جا سکتی ہے..... کیا لمبی چپ بھی احتجاج ہی کی ایک صورت نہیں ہے.... کیا اس احتجاج کی خبر بھی کسی اخبار یا چینل پر آئے گی!!"[۱۸]

یہ اقتباس ناصر عباس نیر کے انشایئے خبر کی بھوک کے آخری جملے ہیں جب کے ان کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے یہ انشایئے کے درمیان یا شروع سے لیا گیا ہو۔خبر کی بھوک میں صحافی کے مفادات، سیاسی مفاد اور فرد کے رویے جو ایک بڑے المیے کی نشاندہی کرتا ہے۔پر مختلف حوالوں سے جائزہ دور حاضر کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ان میں انسان کی بے اطمینانی کا بیان بھی ملتا ہے کہ وہ ان سب مسائل کا شکار اس طرح سے ہوا ہے کہ اب وہ احتجاج کرنے سے بھی قاصر ہے پورا انشائیہ خوبصورت پیرائے میں بیان کرنے کے بعد جس سوالیہ نکتے پر انشایئے کا اختتام جو بظاہر اختتام نہیں لگتا مگر ان کے انداز بیان نے اس میں ایسی خوبصورتی بھری ہے جو پورے انشایئے کو پڑھنے کے بعد ایک مکمل بات محسوس ہوتی ناصر عباس نیر چاہتے تو اسی سے آگے اس کو مزید پڑاؤ دے سکتے تھے مگر یہ ان کے اسلوب کی خوبی ہے کہ جہاں بھی قلم روکتے ہیں ایک سوالیہ انداز جو انسان کو اپنے ارد گرد جانکنے اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔انشائیہ "بوریت" کا اختتام دیکھے

"بوریت دراصل دنیا کی دلدل میں اترے ہونے اور آزادی کی جدوجہد
سے ہاتھ کھینچ لینے کا ایک منجمد لمحہ ہے!اگر مجھے یہ لمحہ اس لیے عزیز ہے
کہ میں اسے پگھلا کر روزمرہ کی یکسانیت آلود دنیا کے متوازی ایک نئ
دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہوں، ایک سچے تخلیق کار کی طرح!"[۱۹]

اس میں بوریت جو آج کے دور میں ہر شخص کا بڑا مسئلہ بن چکا ہے میں انسانی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں کے کیسے لوگوں نے اس کو سر پر سجا رکھا اور اس سے پناہ حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع کا سہارا لیتے ہیں جب کہ اس لمحے کو بھرپور طریقے سے گزارہ جاسکتا ہے۔ جس طرح وہ سوچتے ہیں اس طرح کوئی بھی مثالی فرد یا ادیب ہی سوچ سکتا ہے اور اس کا ذکر وہ خود بھی کر دیتے ہیں کہ کیسے وہ اس لمحے کو ایک سچے تخلیق کار کی طرح سوچتے ہیں۔ اس کا اختتام بھی اس کے آغاز کی طرح لگتا ہے جیسا کہ انہوں نے شروع میں کہا کہ وہ اگر مہینے میں ایک آدھ مرتبہ بور نہ ہوں تو پریشان ہو جاتے ہیں اگر وہ اس جملے کے بعد بھی انشائیہ ختم کر دیتے تو وہی صورتحال محسوس ہوئی تھی جو ان کے آخر سے محسوس ہوتی ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ انشائیے کے اصولوں سے باخوبی واقف ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کا اندازِ بیان ان سب اصولوں پر پورا اترتا نظر آتا ہے۔

اسی طرح اگر ان کے تمام انشائیوں کی مثالیں پیش کی جائے تو انشائیے کی اس خوبی پر پورا اترتے نظر آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان کا اسلوب وضاحتی ہے ہر بات کی وضاحت تو کرتے ہیں مگر جامع اور مختصر انداز میں جس سے نہ صرف قاری محضوظ ہوتا ہے بلکہ اس کی سوچ کو وسعت ملتی ہے جو نئ راہیں متعین کرنے میں معاون ہے۔ ان کے انشائیے انسان کو قنوطیت کی طرف لے جانے کی بجائے مثبت راہیں دیکھاتے ہیں جو قارئین کو منفی تاثرات سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں.

ہ۔ غیر رسمی انداز

انشائیے کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز اور انجام غیر رسمی ہوتا ہے یعنی انشائیے میں نہ کوئی تمہید باندھی جاتی ہے اور نہ کوئی نتیجہ اخز کیا جاتا ہے یعنی جو بھی بیان کرنا ہو اس کو کہیں سے بھی شروع کر کے

کہیں بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ انشائیے کا اسلوب ہلکا پھلکا اور غیر سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس میں رسمی طریقہ کار کی بجائے غیر رسمی انداز اپنایا جاتا ہے۔ مقالہ یا مضمون کو سنجیدہ اور مکمل قرار دیا جاتا ہے جبکہ انشائیہ کیونکہ منتشر خیالات اور ذاتی تجربات کی پیداوار ہے لہذا اس کا اسلوب بھی غیر رسمی ہوتا ہے۔ انسان رسمی اور غیر رسمی طور پر باتیں سیکھتا اور ان کا زندگی میں اطلاق کرتا ہے اور انشائیہ نگار جب انشائیہ لکھتا ہے تو وہ ہر طرح کی زبانی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ انشائیے کے اس غیر رسمی انداز کو بے ربطی بھی کہا گیا ہے۔ سلام سندھلوی مضمون "انشائیہ کا مطالعہ" میں انشائیے میں بے ربطی کے عناصر پر بات کرتے ہوئے مرے اور جانسن کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "مرے (Murray) کے نقطۂ نظر سے انشائیہ کی دوسری خصوصیت اس کی بے ربطی ہے اس میں خیالات کو غیر منظم طریقہ پر پیش کیے جاتے ہیں اور اسلوب غیر منطقی ہوتا ہے۔ جانسن بھی انشائیہ کو دماغ کی ایک غیر منظم تخلیق سمجھتا ہے۔"(۲۰)

ایسا انداز ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے آغاز و اختتام کے ساتھ ساتھ ان کے پورے انشائیے کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ کوئی بھی بات کرتے ہوئے انہوں نے غیر رسمی طریقہ کار اپناتے ہوئے اپنے تجربات کو بیان کیا ہے۔ بات کا آغاز غیر اہم سی بات کرتے ہوئے ایسے کرتے ہیں کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی واقع یا شے سے متاثر ہو کر اپنے تجربے کا اظہار کرنے والے ہیں لیکن انشائیے جیسے ہی آگے بڑھتا ہے تو ان کا یہ غیر اہم نکتہ یا واقعہ بھی بے پناہ معنویت اختیار کر جاتا ہے۔ جیسے انشائیہ "خواہش" میں غیر رسمی انداز میں انشائیے کا آغاز کرتے ہیں اور آگے چل کر وہ ایک بے حسی اور بے جا تنقید کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اس انشائیے کا آغاز ملاحظہ ہو:

> "میرے کئی دوست سگریٹ پینے کے عادی ہیں۔ اکثر ایک ہی وضع کے برانڈ پر مرمٹے ہیں۔ وہ برانڈ کی تبدیلی سے یوں بدکتے ہیں جیسے وہ کسی لنگوٹیے یار سے بے وفائی کر بیٹھیں گے۔ مجھے ان کی استقامت سے بہت انسپریشن ملتی ہے۔ یہ استقامت مزاج یا تو کلاسیکی شعرا میں ملتی ہے جو

جس جگہ بیٹھتے تھے مے خانہ ہو جاتا تھا، یا پھر قوالوں کے ہاں جو ایک مصرع کو اتنا بلواتے ہیں کہ ایک ایک حرف میں معنی لشکارا مارنے لگتے ہیں۔"[۲۱]

اس اقتباس کی روشنی میں ہم اس بات کا اندازہ باخوبی لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح غیر رسمی انداز میں اپنے دوستوں سے ملواتے ہوئے ان کے رویے کو شعرا اور قوالوں کے رویے سے نہ صرف تشبیہ دی بلکہ تشبیہ بھی اس انداز سے دی کہ اس میں کسی قسم کی جھجک نظر نہیں آتی۔ان کا انداز طنزیہ اور غیر رسمی ہے۔ناصر عباس نیر کے ہاں فکری کی تازگی اور اسلوب کی بے ساختگی انشائیے کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔انہوں نے کسی بھی موضوع کو بیان کرنے کے لیے بے ساختہ پن کا مظاہرہ کیا ہے۔موضوع سے وابستگی ان کے اسلوب بیان کا خاص وصف ہے جس کے لیے وہ لمبی چوڑی تمہیدوں کا سہارا نہیں لیتے بلکہ مناسب انداز میں جو بات بھی بیان کرنی ہو بیان کر دیتے ہیں مثلاً انشائیہ "خوشی" سے اقتباس دیکھیے:

"خوشی دو طرح کی ہوتی ہے ایک ہاہو،دوسری فقط "ہو"۔ایک لہوولعب،دوسری سکوت محض۔ایک پہاڑی جھرنے کی پر شور لہر،دوسری میدانی ندی کا آبِ سست رو۔ایک ارد گرد کو اپنی چنگھاڑ کی طرف متوجہ کرتی اور دوسری اپنی طرف متوجہ رہتی ہے۔ایک دنیا کے تعاقب میں،دوسری کے تعاقب میں دنیا ایک ہر جگہ شاید ہر پل موجود ،دوسری کہیں کہیں کم کم موجود۔ایک آدمی کی منتظر تو دوسری کا منتظر آدمی!"[۲۲]

خوشی ایک عام سا نیا عنوان ہے جس کا عمل دخل ہر ایک کی زندگی سے جڑا اس اقتباس سے واضح ہے کہ خوشی کے اصرار ور موز پر بات کرنے کے لیے نے ناصر عباس نیر نے خوشی کو مخاطب کرتے ہوئے بنا کسی تمہید کے خوشی کو بیان کیا ہے اس میں ندرت اس گہرائی سے پیدا کی ہے کہ خوشی جو بظاہر ایسا عنوان لگتا ہے جس پر کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں مگر ناصر عباس نیر کا تخیل اس قدر وسیع ہے کہ وہ اس کے بھی اسرار ور موز

بیان کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کا قلم اتنی تیزی سے چلتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کچھ بھی کہنا ہو صاف وشفاف انداز میں کہہ دیتے ہیں۔

ان کے ہاں نئے نئے انداز سے قاری محضوظ ہوتا ہے جیسا کہ "نئے موسموں کی ہوا" میں ملکی معشیت کے کھوکھلے پن کا اظہار ایسے کیا کہ بات کوئی ہو رہی ہو موضوع کوئی اور ہو اور تنقید کی زد میں کوئی اور ان کے انشائیوں میں ان کی یہ مہارت دیکھتے ہوئے ان کے اس انداز کو لاثانی قرار دیا جائے تو بے جانہ ہو گا ان کے ہاں تجربات تخیلی سطح پر پیدا ہوتے محسوس نہیں ہوتے بلکہ عملی نقطے اور حکمت افروز باتیں ہوتی ہیں۔بعض مقامات پر ان کی باتیں کہانی کی شکل اختیار کرنے لگتی ہیں جب وہ مناظر کے ساتھ فطری جذبات کو قلم بند کر رہے ہوں۔انہوں نے معاشرے کے کرب کو انشائیے کی بنت کاری میں سلیقے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

و۔ فطرت نگاری

صنف ادب شاعری ہو یا نثر اس میں فطرت نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔فطرت "نیچر" کے مترادف وسیع مفہوم رکھتا ہے۔فطرت نگاری سے مراد کائنات کی خاجی صورتحال کا بیان ہے جس میں موضوعات کا عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ مادی اشیا کی عکاسی کرنا؛ جس میں مظاہر فطرت کے جمال اور حسن یعنی پھل، پھول، پیڑ، ندیاں، پہاڑ، چرند پرند کی رنائیاں وغیرہ جیسی خوبصورتیوں کے ساتھ ساتھ خوفناک مظاہر زلزلہ، سیلاب وغیرہ کی عکاسی ان مظاہر کے احساسات اور ان مظاہر کا جو آپس میں تعلق ہے اور انسانی احساسات کے ساتھ جو ان مظاہر کی مماثلت ہے ان کا بیان فطرت نگاری کے ضمن میں آتا ہے۔فطرت نگاری کا تعلق مادی اشیا پر تو مشتمل ہو سکتا ہے مگر اس میں موضوعات کا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ ہی انسان کی بنائی ہوئی کسی شے سے اس کا تعلق ہے۔اس ضمن میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

> "بطور اصطلاح اور ادبی تحریک کے فطرت نگاری سے دو صورتیں مراد ہیں:۱۔خارجی مظاہر میں پھیلے ہوئے جمال و جلال کی سچی تصویر کشی۔۲۔انسانی سرشت میں موجود تمام جبلتوں، احساسات وجذبات اور فکر وخیال کی آزادانہ عکاسی اس صورت میں کہ جیسے علم وخبر اور تہذیب

> و شائستگی کے دور سے پہلے انسان میں موجود تھیں، گویا تعلیم تہذیبِ انسانی سے ماوراہو کر انسانی جذبات کا بیان فطرت نگاری ہے۔"(۲۳)

پروفیسر انور جمال فطرت نگاری کو بطور اصطلاح اور ادبی تحریک بیان کرتے ہوئے اس کی دو صورتیں بیان کرتے ہیں جس سے اس کے معنی و مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔یعنی خارجی مظاہر کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ جذبات و کیفیات کا بیان بھی فطرت نگاری کہلائے گا۔

ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے اسلوب کی اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے موضوع کو بالکل فطری اور روز مرہ گفتگو کے انداز میں پیش کیا ہے۔انشائیے کا تعلق کیوں کہ کسی خاص طبقے سے نہیں ہوتا اس کی زبان عام قاری کے فہم کے مطابق ہوتی ہے۔جس کا خیال ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں رکھا گیا ہے انہوں نے فطری زبان استعمال کرتے ہوئے فطرت اور ادب کا خاص امتزاج پیدا کیا ہے۔فطرت کا ایک فرد چیونٹی،جو نہایت حقیر تصور کی جاتی ہے۔ایک باقاعدہ منظم نظام کے تحت کام کرتیں ہیں خالق نے انسانوں کی طرح ان کے اندر بھی صلاحیتیں رکھی ہیں جن کو استعمال میں لا کر یہ اپنی زندگی آسان بناتی ہیں۔ناصر عباس نیر نے انشائیہ چیونٹی میں فطرت کی اس ننھی مخلوق کے اسرار بیان کرتے ہوئے چیونٹی کا انسانی فطرت سے موازنہ پیش کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> "ایسا نہیں کہ چیونٹیاں اپنی حیاتِ یک دوزہ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتیں۔وہ کارنامہ دیتی ہیں، مگر ہماری طرح وہ اپنی چھوٹی بڑی کامیابیوں کا اعلان چیخ چیخ کر کرنے کے مرض میں گرفتار نہیں ہیں۔ہمارے لیے کوئی کام اس وقت کارنامہ بنتا ہے جب لوگ ہمیں ہار پہنائیں، اخبار میں تصویر چھپے اور اسے دنیا میں Breaking News کے طور پر پیش کیا جائے۔"(۲۴)

اس میں نہ صرف انسانی فطرت کے اس پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے جس میں وہ تھوڑے سے کام پر ڈھیر داد وصول کرنے کا دلدادہ ہے بلکہ اسلوبی سطح پر جس طرح سے انہوں نے انسان کی اس روش کو لفظیات کے

سانچے میں ڈھالا ہے وہ انداز بھی گہری معنویت کا حامل ہے۔انہوں نے غیر محسوس انداز میں بہتری کی تجاویز بھی پیش کیں جو نفسیاتی سطح پر قاری کو متاثر کرتی ہیں۔رجائیت اور امید ان کے انشائیوں کا خاص پہلو ہے۔تلخ سے تلخ صورتحال میں بھی وہ زندگی کی خوبصورتیوں میں کھو جانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کی باریک بینی اور جذبات نگاری سے مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

انسان جب آگے نکلنے اور اسٹیٹس کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو پھر دنیا کو دیکھنے کا انداز اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں تبدیلی آجاتی ہے وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ناصر عباس نیر نے انسان کے اس رویے کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ان کے مطابق دنیا میں آگے نکلنے کا خمار انسان کی صلاحیتوں اور زندگی کی رنگینیوں اور مسرتوں کا لطف اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے یوں اس کے احساسات و جذبات مفلوج ہو جاتے ہیں۔جبکہ اصل بڑا پن شان و شوکت تو فطری حسن کی غماز ہے۔ان کے انشائیوں میں فطرت کے خوبصورت مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔انہوں نے کہیں کہیں فطرت کو منظر برائے منظر کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔

انشائیہ "کتنا قریب کتنا دور!"میں قدرت کے حسین مناظر کو بیان کرنے کے لیے ان کے وجود کو حساسات کے ساتھ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "سامنے کے پہاڑ پر بادلوں کے جتھے خراماں خراماں گزر رہے ہیں۔لگتا ہے بادل پہاڑوں کو ہمدردی کے گیت سنائے جارہے ہیں۔بھائیو!گھبراؤ نہیں،تم صدیوں سے ایک جگہ جمے کھڑے ہو۔استقامت کا بوجھ اٹھائے تم تھک چکے ہوگے،ہمیں تم ہمیشہ رشک سے دیکھتے ہو کہ ہم کتنے آزاد ہیں مگر تمہیں معلوم نہیں کہ ہماری آزادی بکھر جانے میں ہے۔گھنے بادلوں کے ایک بڑے قافلے نے پہاڑ،بالکل ڈھانپ دیا ہے اور اب سارا منظر ہی بدل گیا ہے۔دور کے مناظر کے چھپ جانے سے قریب کا منظر کہیں زیادہ اجلا ہو گیاہے۔سامنے کے درختوں کا رنگ پہلے سے کہیں شوخ اور پیارا ہو

گیا ہے۔ پیچھے سے پہاڑ کی موجودگی نے ان کو کتنا معمولی اور چھوٹا۔۔۔ بلکہ
بے نام سا بنا رکھا تھا۔ اب ان کا قد اور بھی بڑھ گیا ہے۔"(۲۵)

وہ موضوع کے اعتبار سے قاری کے سامنے نئی نئی پرتیں کھولتے جاتے ہیں اور قاری ان کے ساتھ ساتھ ان سب مناظر کا نظارہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر کا یہ پیرایہ اظہار منفرد بھی ہے اور ایک جمالیاتی طرز اظہار کی عکاسی بھی کر رہا ہے۔ ان کے ہاں جمالیاتی قدریں فطرت کی مختلف علامتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا منظر نامہ تشکیل دیتی ہیں جو ایک روشن زندگی کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ ان کی انشائیہ نگاری میں فطرت سے میلان کا ایک خاص رجحان نظر آتا ہے۔ فطرت پسندی اور سماجی زندگی میں ان کی دلچسپی کا اندازہ ان کی لفظیات سے بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ سب ایک نئی روشن زندگی کی علامتیں بن کر سامنے آتی ہیں جو مشینی زندگی کی بے اطمینانیوں سے یکسر آزاد اور خالص فضا کو ظاہر کرتی ہے۔ جس سے فرد روحانی احساسات کو حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے انشائیوں کے متعلق بشیر سیفی لکھتے ہیں:

"تنہائی سے مکالمہ اور فطرت سے معانقہ ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا بنیادی موضوع ہے۔ وہ جب تنہائی میں مظاہر فطرت اور انسانی خصلت پر غور کرتا ہے تو ساری کائنات اس کے اندر سمٹ جاتی ہے، اور وہ انسان اور فطرت کے ازلی روابط سے آشنا ہونے کے بعد اسی طرح وجد میں آتا ہے جس طرح ایک صوفی عالمِ استغراق میں ایک نئی حقیقت پا لینے کی مسرت سے سرشار ہوتا ہے۔"(۲۶)

ان کے ہاں فطرت کا مصنوعی پن نہیں بلکہ انہوں نے حقیقت کی عکاسی کرتے ہوئے لفاظی تراشی ہے۔ ان کے ہاں فطرت کی کہی ایسی جھلکیاں ملتی ہیں جو الگ الگ انداز میں بیان ہوتی ہیں جو روایتی انداز سے ہٹ کر ہے مگر کوئی بھی منظر حقیقت سے دور نہیں بلکہ فطرت کی حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں مناظر جذباتی لگاؤ کے تحت سامنے آتے ہیں اور فطرت ہمدرد اور غمگسار کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ جہاں وہ خوشیوں کا ضامن اور دل کے سکون کا باعث فطرت کو سمجھتے ہیں اور پھر کائنات کے ذرے ذرے میں وہ سکون محسوس کرتے ہیں جو ایک صوفی صوفیانہ منازل طے کر لینے کے بعد پا لیتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ

کرتے ہیں کہ انسان ترقی کرتا چلا جارہا ہے لیکن یہ ترقی اس کو فطرت سے دور کر رہی ہے جس سے فطرت کے کھو جانے کا احساس ان کے انشائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ انشائیہ شام میں کہتے ہیں:

> "خدا نے انسان کے دل بہلاوے کے لیے صبح و شام تخلیق کیے اور اس میں اپنی نشانیاں رکھیں مگر شاید حضرت انسان خدا کے اس فضل کو "شریک رشتہ دار کا احسان گردانتا ہے، اس لیے انسان نے اپنے لیے تفریح کے ہزار رنگ ایجاد کر لیے ہیں اور صبح و شام کو بھولتا جا رہا ہے، خاص طور پر شہر کا باسی۔ اگر یہی حال رہا تو مستقبل کی نسلوں کے درسی نصاب میں شامل ہو گا کہ ایک پیریڈ صبح و شام کی دید کے لیے مختص کریں۔"[۲۷]

دور جدید میں انہوں نے فطرت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے متعدد انشائیوں میں فطرت اور فطری مناظر کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ "سرما کی دھوپ" میں انہوں نے مئی، جون اور دسمبر کے دنوں کا موازنہ کیا ہے کہ کیسے مئی اور جون کے مہینے میں سورج آگ برسا رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہوا بھی گرم ہوتی ہے اور ہر ذی روح سائے کی تلاش میں ہوتا ہے ایسے میں صرف ایک واحد درخت ہیں جو اس سخت حالت میں اس سورج کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہتے ہیں اور خود اس کی تپش کے وار سہتے ہیں جبکہ اپنی ٹھنڈک سے مخلوق کی حفاظت کرتے ہیں اس کے برعکس اگر دسمبر کے دنوں میں یہی دھوپ غنیمت ہوتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں شام، نئے موسموں کی ہوا، فاصلے، کتنا قریب کتنا دور، سرما کی دھوپ، کائنات بوڑھی نہیں ہوتی وغیرہ ایسے انشائیے ہیں جن کے عنوان ہی خالص فطرت سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ زندگی کو نئے زاویۂ نظر سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں آغاز سے لے کر اختتام تک قاری کو زندہ دلی اور زندگی کے مثبت رویوں کو اختیار کرنے، فطرت کے حسن اور زندگی سے لطف اٹھانے جیسے پہلوؤں سے روشناس اپنے اندازِ تحریر اور طرزِ فکر سے کیا ہے۔ یوں ان کے انشائیوں میں نہ صرف فطرت کا حسن ہے بلکہ انسانی و دیگر فطری جذبات و احساسات بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

ز۔ تنوع

انشایئے کی خصوصیات میں موضوعات کی رنگارنگی بھی اہم خوبی ہے۔ جو اس صنف کو غزل کے مماثل لا کھڑا کرتی ہے کیونکہ غزل بھی موضوعاتی اعتبار سے تنوع لیے ہوتی ہے جس کا ہر شعر ایک نیا موضوع رکھتا ہے۔ لیکن انشایئے میں ایک عنوان کے تحت اس میں مختلف حوالوں سے دیگر موضوعات کو شامل کیا جاتا ہے۔ جس طرح موضوعات میں رنگارنگی انشایئے کی اہم خوبی ہے اور انشائیہ نگار ایک انشایئے میں مختلف موضوعات کو قلم بند کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے موضوعات کے قلم بند کرنے کے مختلف انداز بھی تحریر کو دلکش بناتے ہیں۔ انشایئے کا طرز بیان ایسا ہوتا ہے کہ لفظوں کی کاریگری سے انشائیہ نگار ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے جس سے مختلف موضوعات کا بیان اس خوش اسلوبی سے ہوتا ہے کہ قاری کا ذہن ایک کے بعد دوسرا موضوع خود بخود قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ موضوع چاہے کتنا بھی خشک کیوں نہ ہو لیکن اس کا طرز بیان ہی ہے جو اس کی موجودگی میں جان ڈال دیتا ہے اور قاری اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتا ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں موضوعات کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب میں بھی رنگارنگی ملتی ہیں بات سے بات پیدا کرنا اور ایک روشن نئی راہ متعین کرنا ان کے اسلوب میں ندرت پیدا کرتی ہے جو عام شے کو بھی وسیع مفاہیم عطا کرنے میں معاون ہے۔ جمیل آذر ان کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ناصر عباس نیر کا کمال یہ ہے کہ وہ عام گری پڑی اشیاء کو ایک متجسس ناظر کی حیثیت سے اٹھا کر جھاڑ پونچھ کر کے دیکھتا ہے، غور کرتا ہے اور ان میں جہان معنی تلاش کر لیتا ہے۔ تخلیق کا کوندا اس کے ذہن کو منور کرتا چلا جاتا ہے تا کہ وہ اس کوندے کو اپنے انشایئے میں منقلب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میں ناصر عباس نیر سے اس بات پر متفق ہوں کہ انشائیہ چراغ کی مانند ہے جو نہ صرف سامنے کے غائب اور بوجھل گوشوں کو روشن کرتا ہے بلکہ نا موجود کو موجود اور محسوس بناتا ہے۔"(۲۸)

ان کا اسلوبِ تحریر ہمارے معاشرتی رویوں کی احسن طریقے سے تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ پہلو اہم ہے کہ ناصر عباس نیر کو قدرت کی طرف سے چیزوں کے نہ صرف متنوع پہلو دیکھ لینے کی صلاحیت عطا ہوئی ہے بلکہ وہ چیزوں کے نئے معانی کی نئی جہتیں دریافت کرنے کی خوبی سے بھی مستفد ہیں۔ یہ صلاحیت ایک کامیاب انشائیہ نگار کی موجودگی کی غماز ہے۔

کسی بھی فنکار کے لیے لازم ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھائے اس کا باریک بینی سے مشاہدہ کرے اور ہر جہت کا احاطہ کرنے کی قدرت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ جو کہ ناصر عباس نیر کے پاس ہے یہی اظہار ان کے انشائیوں کی پہچان بن گیا۔ انہوں نے انشائیوں میں اپنے تجربات اور معلومات کے اظہار کے لیے ایسا انداز اپنایا جس سے قاری کی سوچ کو وسعت عطا ہونا ان کی علمیت کا اظہار کرتا ہے۔ موضوع چاہے کوئی بھی ہو اس پر بلا تکلف لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن ان کی متنوع تخلیقی صلاحیت کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اپنے انشائیوں میں تازہ معنی کی تخلیق اور انفرادی زاویوں کی دریافت کی ہے اور بڑے قرینے کے ساتھ اپنے خیال کی چمک کو تخلیقی تقاضوں سے مزین کر کے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں ایک متنوع کائنات تخلیق کی ہے جس میں مختلف پہلوؤں کی طرف بڑی کشادگی اور فنی بصیرت کے ساتھ قاری کو ایک شعوری کیفیت سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ معنوی لطافت اور شگفتگی ان کے انشائیوں میں رچی بسی ہے۔ یہ متنوع پرت ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے انشائیوں کو اعلیٰ تخلیقی مدارج عطا کرتے ہیں۔"(۲۹)

ان کے اسلوب کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے کے جب بھی کوئی بات کہتے ہیں ایک جملے میں مکمل بات اختصار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کرنے کے بعد ساتھ ہی اس بات کی وضاحت اگلے ہی جملے میں کر دیتے ہیں جس سے ان کا اسلوب وضاحتی رنگ اختیار کرنے لگتا ہے جبکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ قاری اس بات کا مکمل ادراک کر سکے۔ ان کے اس اسلوب کو ان کے تمام انشائیوں میں باخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کی بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی اسی بے ساختگی اور شگفتگی سے تصویر کے دو رخ

دیکھاتے ہیں۔ جس سے تحریر نہ صرف شگفتہ ہوتی ہے بلکہ اسلوب میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے اس انداز بیان نے ان کے اسلوب میں جدت پیدا کی ہے کیوں کہ کسی بھی بات کے دورخ متعین کرنا ان کے اسلوب کا خاص حصہ ہے۔

"کائنات کے اصل دو چہرے ہیں۔ ایک چہرہ مادر مہربان کا اور دوسرا سخت گیر حاکم کی مانند۔"(۳۰)

جیسا کہ اس اقتباس میں کائنات کے دو چہرے بتاتے ہوئے پھر ان دو چہروں کو واضح کرتے ہیں کہ کون سے دو چہرے ہیں۔ انہوں نے واقعات کے بیان میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔ جس سے ان کی فکر کے ساتھ ساتھ اسلوب کی لطافت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

انسان اپنے وجود اور اس کائنات اور اس کے خالق کی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ کائنات کو دیکھ کر انسان کے ذہن میں ان تمام چیزوں کے خالق کے متعلق سوالات ابھرے۔ اس کائنات کے اسرار جاننے کے لیے اس میں اضطراب پیدا ہوا۔ یوں انسان تسخیر کائنات کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ آسمان تک جا پہنچا۔ ذات کی تلاش، کائنات کی تلاش، حقیقت مطلق نے اسے مضطرب کیا اور وہ کائنات کے اسرار جاننے کے لیے یہ بھی اندازے لگانے لگا کہ یہ سارا نظام کب اور کیسے وجود میں آیا۔ اسی طرح اس کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ اس کائنات کا وجود کتنا پرانا ہے لیکن ناصر عباس نیر نے اپنے فن کمال سے یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی ہے کہ کائنات کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ کائنات کا وجود کائنات میں ایک ایسا وجود ہے جو ماضی، حال اور مستقبل میں ایک ہی تسلسل سے آفاقی رہنے والا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ناصر عباس نیر نہ صرف خود غور کرتے ہیں بلکہ اپنے قاری کو بھی ہر اس بات کو سوچنے کی دعوت دیتے ہیں جس کا ادراک وہ خود کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں تجربات کا بیان لطافت کی چاشنی سے پُر ہے۔ آپ زندگی کی ہر شے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چاہے زندگی تاریکی میں اندھیروں کا سفر ہی کیوں نہ طے کرنے لگے لیکن آپ اس میں بھی جینے کی کرن

روشن کر دیتے ہیں۔ جو جدیدیت کا رجحان لیے ہوئے ہے۔ آل احمد سرور جدیدیت کے وہی موضوعات جو ناصر عباس نیر کے ہاں ملتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی، اس کی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے، اس میں انسانیت کی عظمت کے ترانے بھی ہیں۔ اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بے زاری، فرد پر توجہ، اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کے موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہے۔" [۳۱]

جدیدیت میں مختلف موضوعات و میلانات مثلاً شہری زندگی اور صنعتی تہذیب سے پیدا ہونے والی تنہائی، مایوسی، حزن و ملال، خوف و تشکیک، اقدار شکنی کے ساتھ ساتھ سماج کے کرب کو بھی ذات کے داخلی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں انشائیہ " تنہائی"، "بوریت"، "موت"، "خاموشی" وغیرہ اس رجحان کے عکاس ہیں۔

ناصر عباس نیر نے جو موضوعات منتخب کیے ان میں بے پناہ وسعت اور تنوع ہے۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ بہت عمیق ہے اور ان کے تجربات بھی وسیع ہیں انہوں نے اپنے ماحول سماج اور ارد گرد کی زندگی کو بڑی گہرائی سے دیکھا، سمجھا اور برتا ہے۔ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں اور اس کا تجزیہ ہر پہلو سے کرتے ہیں۔ جو ایک انشائیہ نگار کی بڑی خوبی ہے۔ موضوع چاہے کوئی بھی ہو لیکن اس کا پیرائے اظہار بھی ان کے ہاں مختلف ہے کبھی فطرت کا سہارا تو کبھی لفاظی نادر تشبیہات کا سہارا اور غیر مرئی چیزوں کو مرئی حالت میں پیش کرنا وغیرہ ان کے اسلوب میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ یوں ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں بیک وقت اسلوب اور موضوع دونوں اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے۔ موضوعاتی تنوع جو انشائیے کی خصوصیت ہے اس اعتبار سے ان کا انداز بیان گہرے مشاہدے کا حامل ہے۔ انہوں نے متنوع موضوعات کو مختلف منظر ناموں سے پیش کیا ہے۔

ح۔ زبان و بیان

زندگی کے روزمرہ معمولات کو چلانے کے لیے ہمیں زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی ایک وسیلہ اظہار ہے جس کے ذریعے ہم اپنی بات دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ جذبات و احساسات اور دکھ درد کی ترجمانی کے لیے زبان بہترین وسیلہ اظہار ہے۔ عام اور روزمرہ بول چال کے علاوہ ادب میں شاعری ہو یا نثر اس کے لیے بھی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ادبی تخلیق زبان کے استعمال کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی لیکن ادب میں استعمال ہونے والی زبان روزمرہ عام بول چال کی زبان سے خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ انشائیہ ایک غیر افسانوی نثری صنف ادب ہے جو زبان و بیان کے خاص اسلوب سے مزین صنف ہے۔ ناصر عباس نیر کا اندازِ بیان معنویت سے بھرپور ہے۔ الفاظ و تراکیب، محاورات کا برجستہ استعمال ان کے اسلوب کی نمایاں خوبی ہے۔ انہوں نے جملوں کے اختصار سے جہاں وسیع تر مفاہیم قاری تک منتقل کیے وہیں تشبیہات و استعارات کے ذریعے انشائیے میں دلکشی پیدا کی ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال نے ان کے انشائیوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ ان کے ہاں ایک ایسا جہان استعارات اور تشبیہات آباد ہے جو ان کے انشائیوں کو لفظی و معنوی سطح پر بلند کرتا ہے۔ زبان کے حوالے سے ان کی بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے موضوع کو فطری اور روزمرہ گفتگو کے انداز میں پیش کیا ہے یہاں تک کے فلسفیانہ گفتگو بھی عام قاری کی ذہنی سطح کے مطابق کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نئی اچھوتی تشبیہات ہیں۔ جیسے انہوں نے اپنے انشائیوں میں دلہن کو مختلف مقامات میں مختلف چیزوں کے ساتھ اس کے احساسات و جذبات کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جیسا کہ "کائنات بوڑھی نہیں ہوتی" میں کائنات کو دلہن کے روپ سنگھار سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کائنات نئی نویلی دلھن کی طرح ہے جو روز سنگھار کرتی ہے اور اس کا ہر دن جو پہلے سے زیادہ چمکیلا اور نکھرا ہوا اور تازہ تازہ استری شدہ سفید کاٹن کے سوٹ کی طرح ہوتا ہے تو اس لیے کہ یہ تاریکی کو روشنی میں بدلنا اور اپنی اس کامیابی پر مسکرانا جانتی ہے۔"[۳۲]

اس طرح انشائیہ "کمرہ" میں کتاب کے ناز اٹھانے کو دلہن کے ناز اٹھانے سے تشبیہ دیتے ہیں۔یونہی انشائیہ "شام" میں شام کی آمد کو دلہن کی سسرال میں پہلی بار آمد سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شام اس قدر ہولے سے افق پر قدم رکھتی ہے جیسے دلھن پہلی بار سسرال کی دہلیز پر قدم رنجہ فرماتی ہے، لجاتی ہوئی!مگر جس طرح دلھن کی موجودگی سے ایک دم سارا گھر اپنی جملہ مصروفیات ملتوی کر کے دلھن کا خیر مقدم کرنے اور اسے ایک نظر جی بھر کے دیکھ لینے کو اٹڈ پڑتا ہے مگر دلہن سب سے بے نیاز اور شانت ہوتی ہے،کچھ ایسا ہی حال شام کا بھی ہے۔"(۳۳)

اسی طرح ہر بات کے بیان کے لیے ناصر عباس نیر کے پاس نئی اور اچھوتی تشبیہات ملتی ہیں۔جیسا کہ انشائیہ "معنی" میں معنی کی نمود سے پہلے کی زندگی کو مرغی کے ڈربے سے تشبیہ دیتے ہیں اور معنی کی نمود کے بعد زندگی کو شاہین کی ماند قرار دیتے ہیں۔اسی طرح "ناتجربہ کاری" میں تجربہ کار آدمی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ زندگی کو دیگ تصور کرتا ہے جو ذرہ سا چکھ کر ہی بتا دیتا ہے کہ دیگ کیسی ہے۔تشبیہات کے ساتھ ساتھ استعارات کا استعمال بھی کرتے ہیں اور مختلف پہلوؤں کو استعارات کے مماثل بھی قرار دیتے ہیں۔ جیسے "دائرہ"کو سفر کی معنویت کا استعارہ کہا اسی طرح "شہرت" کو ساون کے چنگھارتے بادلوں کا استعارہ قرار دیتے ہیں اسی طرح استعارات کے استعمال میں بھی ان کا نیا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی طرح مسائل کے بیان اور معنی کی وضاحت کے لیے بھی استعارات کا سہارا لیتے ہیں انشائیہ "دائرہ در دائرہ" سے مثال دیکھیے۔

"فلسفیانہ مباحث کو سمجھنا ہو تو دائرے کی خدمت مستعار لی جا سکتی ہے۔"(۳۴)

اسی طرح ایک ہی چیز کے لیے مختلف استعارے اور ان کے مستعار لینے کی وجہ واضح کرتے ہیں جو تحریر میں دلکشی پیدا کرتی ہے۔اسی طرح ان کی زبان تراکیب محاورات اور ضرب المثال کے ساتھ پُر روزمرہ کے بول چال کے مطابق ہے۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا،باتوں میں لگانا،آنکھوں میں دھول جھونکنا جیسے

محاورات، اسی طرح خوبصورت تراکیب جیسے: تصور کی بھاری زنجیریں، نقاب اندر نقاب، دنیا بازیچۂ اطفال وغیرہ کا استعمال باخوبی کیا ہے۔ اس طرح ضرب المثل جیسے: دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی، تصور کے آوارہ پرندے، دور کے ڈھول سہانے وغیرہ کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے ضرب المثل کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی ہے جیسے "رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپ ہی رانجھا ہوئی" وغیرہ زبان کے استعمال میں خوبصورتی پیدا کرتی ہیں۔

ان کے انشائیوں میں بزرگوں کے اقوال کا سہارا بھی اسلوب میں نیا پن پیدا کرتا ہے۔ "بیماری" میں بیمار "حاکم" کے اس لمحے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب وہ مکمل طور پر علیل ہو جاتا ہے اس وقت جان نشین کا تقرر کرتے ہوئے بزرگوں کے قول کی نصحیت کرتے ہوئے کہتے ہیں زندگی اور تخت شاہی آنی جانی شے ہے۔ اسی طرح "جھوٹ اور سچ" میں لکھتے ہیں۔

> "کسی سیانے کا قول ہے کہ جھوٹ وہی شخص بولتا ہے جو سچ کہنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔"[۳۵]

یہ مصنف پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کے الفاظ کا استعمال کرے۔ ناصر عباس نیر کے ہاں الفاظ کا چناؤ ایسا کیا گیا ہے کہ ذہن کی آزاد فضا معنی متعین کرتی ہے زبان کے حوالے سے ان کے اسلوب میں تابع مہمل اور تابع موضوع کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو اردو بول چال کا ایک خاص انداز ہے۔ جن الفاظ کے ساتھ بے معنی الفاظ بولے جائیں وہ تابع مہمل اور جن الفاظ کے ساتھ وہ معنی دار الفاظ جوڑے جائیں جو حقیقت میں تو اپنے خاص معنی رکھتے ہوں مگر پہلے لفظ جس کو اصطلاح میں "متبوع" کہتے ہیں کے ساتھ جوڑا جائے تب وہ اپنے معنی بدل دیتے ہیں ان الفاظ کو تابع موضوع کہا جاتا ہے۔ زبان کی اس خوبصورتی اور رنگارنگی کو ناصر عباس نیر نے اپنے انشائی اسلوب میں خاص جگہ دی ہے مثلاً انشائیہ "کمرہ" میں کمرے کے اسرار و رموز کو خوشگوار اور فطری فضا سے منور کرتے ہوئے شعور کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں اور انگریزی فلم کے ہیرو کی مثال دیتے ہیں۔ جس نے پابند سلاسل میں چڑیوں سے دوستی کر لی تھی۔ اس حوالے سے تابع مہمل کی مثال لیے ہوئے اقتباس پیش ہے۔

"اس نے خود کو میزبان تصور کیا اور چڑیوں کی تواضع کیڑوں مکوڑوں سے کرنے لگا جنھیں وہ کافی محنت سے گھیر گھار کے پکڑ تا۔"(۳۶)

اس میں کیڑوں کے ساتھ مکوڑوں اور گھیر کے ساتھ گھار کی اضافت جیسے الفاظ تابع مہمل ہے۔اسی طرح انشائیہ "بیماری" میں بیماری کے عالم میں انسان کی کیفیات اور تندرستی میں اس کی حالت ذار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوگ زندگی سے اندھادھند محبت کرتے ہیں۔۔۔وہ بیماری کے خلاف اپنی دسترس میں جملہ توپ و تفنگ سے لے کر تعویز گنڈے اور منتر جنتر کی قوتوں کے ساتھ صف آراہو کر ،اصل میں موت کو مات دینا چاہتے ہیں،۔۔۔ بیماری ایک ایسا تجربہ ہے جو زندگی کی بہت سی بدصورتیوں کا قلع قمع کرتا ہے۔۔۔ایک ہٹا کٹا انسان تو ہمہ وقت باہر کے ماحول پر حکمران بننے کی مشق کرتا رہتا ہے۔۔۔اس عافیت کدے میں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہاں اس کا سارا کچا چٹھا موجود ہے۔"(۳۷)

انشائیہ "بیماری" کے ان اقتباسات سے ان کا اسلوب اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔اس میں "اندھا دھند"، "توپ و تفنگ"، "تعویز گنڈے"، "منتر جنتر"، "کچا چٹھا" وغیرہ تابع مہمل اور تابع موضوع کی مثال ہے۔انشائیوں میں تابع مہمل اور تابع موضوع کے استعمال سے زبان میں جو چاشنی پیدا ہوتی ہے وہ بھی بخوبی عیاں ہوتی ہے۔اسی طرح دیگر انشائیوں میں بھی انہوں نے زبان و بیان کے اس انداز کو بخوبی برتا ہے۔جیسا "کتنا دور کتنا قریب میں "قدرتی مناظر دیکھنے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ان مناظر سے علیک سلیک میں وقت گزارتا ہوں۔اس انداز بیان سے ان کے انداز کی بے تکلفی بھی نمایاں ہوتی ہے۔محاورات اور ضرب الامثال کی فطری فراوانی، نئی نئی اچھوتی تشبیہات اور عدم المثال استعارے ان کی زبان کا حصہ ہے۔ضرب الامثال فردِ واحد کے ذاتی تجربات،مشاہدات و مطالعات کی بناپر وجود میں آتی ہیں۔اسی طرح روزمرہ زبان کا ایک خاص معیار ہے جس کے تحت اسلوب میں تسلسل اور روانی پیدا ہوتی ہے۔جس کا خاص اہتمام ناصر عباس نیر کے انشائی اسلوب میں ملتا ہے۔

انہوں نے اصول و ضوابط عروض و قواعد کے اصولوں کو بھی بخوبی نبھایا ہے لفظوں، محاورات و تشبیہات کے استعمال سے شگفتگی اور اسلوب بیان کی لطافت کو اجاگر کیا۔ جیسا کہ سلیم آغا قزلباش نے انشائیے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ایک مضمون میں بیان کیا تھا کہ "تشبیہاتی، تلمیحاتی، استعاراتی اور تمثیلی انداز بیان کا تعلق تو زبان کی تر و تازگی اور نفاست سے ہے لیکن اگر ان کا زیادہ استعمال کیا جائے تو اسلوب مرصع سازی کا موجب بن سکتا ہے۔"[۳۷] ناصر عباس نیر نے تشبیہاتی سلسلہ ایسے اپنایا کہ وہ مرصع سازی کی بجائے انشائیوں میں شگفتگی کا موجب بن جاتا ہے۔ تشبیہاتی سلسلہ جس کو انشائیے کی خامی کہا جا سکتا ہے وہی ان کے انشائیے کی خوبی بن کر ابھرتا ہے۔ ان کا یہ انداز زبان میں رنگینی پیدا کرنے سے زیادہ اپنی بات کو بہتر طور پر سمجھانے کے کام آتا ہے جو کسی قسم کا ابہام نہیں رکھتا۔ اسی زبان کے سہارے وہ اپنے جذبات و احساسات کی عکاسی احسن طریقے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں نئی نئی سمتیں پیدا کیں۔ ان کی ذہانت، قابلیت اور دور اندیشی سے انشائیوں میں جدت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہندی پنجابی اور انگریزی الفاظ کی آمیزش سے وہ تاثر پیدا ہوا ہے جو جدید دور میں مانوس اور فطری ہے۔ ان زبانوں کے الفاظ کا استعمال انشائیوں میں موقع کی مناسبت سے ملتا ہے۔ ان کے انشائیے مواد، موضوع، عنوان، محاورات، تشبیہات اور استعارات کے استعمال عرض ہر اعتبار سے جدید ہیں۔ اسلوب کے ضمن میں لفظوں کا چناؤ اور چنے ہوئے لفظوں کا بر محل استعمال بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے ہاں یہ خصوصیت موجود ہے کہ وہ اپنے انشائیوں کی معنوی اور فنی ضرورتوں کے عین مطابق الفاظ کا چناؤ کر کے انہیں استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کا یہ پیرایہ اظہار ان کے اسلوب کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول، جون ۱۹۸۹ء، ص۳۶

۲۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۶ء، ص۴۰

۳۔ وزیر آغا، فلیپ چراغ آفریدم، ناصر عباس نیر

۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۱۲۰

۵۔ ایضاً، ص۳۶

۶۔ ایضاً، ص۱۱۰

۷۔ ذوالفقار احسن "چراغ آفریدم" ایک جائزہ مشمولہ اسالیب سہ ماہی کتابی سلسلہ نمبر ۲۵ فروری تا مئی ۲۰۱۸ء، ص۲۵

۸۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص۴۹

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۱۳۲

۱۰۔ ایضاً، ص۱۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص۵۲

۱۲۔ ایضاً، ص۴۰

۱۳۔ محمد اسد اللہ، انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص۸۰

۱۴۔ نصیر الدین احمد، سید، فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری، بوگس حیدر آبادی عثمانیہ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۶۲

۱۵۔ صفی مرتضیٰ، سید، اردو انشائیہ، نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۹

۱۶۔ سکندر حیات میکن، ڈاکٹر، میرے استاد مشمولہ چہار سو، ص ۴۹

۱۷۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص ۷۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۰۔ سلام سندیلوی، انشائیہ کا مطالعہ، مشمولہ، انشائیہ کے فنی سروکار، ڈاکٹر احمد امتیاز، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۳

۲۱۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص ٦۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۲۳۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص ۱۳۸

۲۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص ۱۲۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۷۴

۲٦۔ بشیر سیفی مشمولہ چراغ آفریدم، ناصر عباس نیر، ص ۱۳٦

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۸۔ جمیل آذر، پروفیسر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، ص ۱٦۰

۲۹۔ سکندر حیات میکن،ڈاکٹر،ڈاکٹر ناصر عباس نیر بطور انشائیہ نگار، مشمولہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد شمارہ۲۱، ستمبر ۲۰۱۵ء، ص۱۳

۳۰۔ ناصر عباس نیر،ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۱۱۸

۳۱۔ آل احمد سرور، ادب میں جدیدیت مشمولہ جدیدیت اور ادب، (مرتبہ) شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، ص۹۶

۳۲۔ ناصر عباس نیر،ڈاکٹر، چراغ آفریدم، ص۱۱۲

۳۳۔ ایضاً، ص۲۱

۳۴۔ ایضاً، ص۴۰

۳۵۔ ایضاً، ص۱۱۴

۳۶۔ ایضاً، ص۱۲

۳۷۔ ایضاً، ص۱۸-۱۹

۳۸۔ سلیم آغا قزلباش، انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، مشمولہ جدید اردو انشائیہ (مرتب) اکبر حمیدی، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص۷۷

باب چہارم: ماحصل

مجموعی جائزہ

تحقیقی نتائج

سفارشات

کتابیات

مجموعی جائزہ

ادب کی لطیف اور لچک دار صنفِ ادب "انشائیہ "ہے۔اس صنفِ ادب میں کوئی مخصوص موضوعات نہیں ہوتے بلکہ ادیب اپنی تخلیقی صلاحیت اور مزاج کے مطابق کسی بھی موضوع کا انتخاب کر سکتا ہے۔اس میں با آسانی شخصی تاثر کے ذریعے سماجی حقیقت اور زندگی کی عملی صورت اور ذاتی تجربات اور خیالات کو پیش کرتے ہوئے قاری کے سامنے فکر کی نئی راہیں ہموار کی جاتی ہیں۔انشائیہ نگار کے تعارف کے بعد اس تحقیق کی ابتدائی بحث انشائیے کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے متعلق تھی۔اس ضمن میں سب سے پہلے اس بات کو مد نظر رکھا گیا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔

"انشائیہ "صنفِ ادب کیا ہے اس کے اصول اور اردو ادب میں ابتدا سے متعلق بنیادی امور کا جائزہ باب اول میں لیا گیا ہے۔ جس سے انشائیے کے خدوخال کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو انشائیہ نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا اولیت کا درجہ رکھتے ہیں انہوں نے باقاعدہ اس صنفِ ادب کو پروان چڑھانے کے لیے تحریک چلائی اور یہ صنفِ ادب انگریزی کے پرسنل ایسے کے مترادف ہے جس کی ترقی اور ترویج میں وزیر آغا اور ان کے ہم عصر نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد نے پہلی مرتبہ اس صنف کے حوالے سے طبع آزمائی کی۔

اردو کے انشائی ادب میں ناصر عباس نیر اہم مقام رکھتے ہیں۔اردو ادب میں ان کے تعارف کا سبب ان کی جدید تنقید،انشائیہ نگاری اور افسانہ نگاری ہے۔اس مقالے میں ان کے موضوعات اور اسلوب کو پرکھنے کی کوشش کی گئی۔ان کی زندگی کے مختصر کوائف باب اول میں پیش کیے گئے جس میں ان کی تخلیقی اور تنقیدی جہات کی فہرست بھی مرتب کی گئی ہے۔چونکہ اس تحقیقی مقالے کا مقصد ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا موضوعاتی اور اسلوبی مطالعہ ہے لہٰذا بنیادی مباحث کے بعد باب دوم میں ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں متصوفانہ،سماجی،نفسیاتی،ادبی،اخلاقی اور فلسفیانہ موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔جبکہ باب سوم ان کے انشائیوں کے اسلوبی مطالعے پر مشتمل ہے۔اس باب میں انشائیے کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا اسلوبی جائزہ لیا گیا ہے۔

ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں مطالعے کی وسعت، تجربات کی گہرائی اور مشاہدے کی سچائی جابجا قائم ہے ان کے انشائیے قاری جیسے ہی پڑھنے لگتا ہے ان کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ انشائیے کے آغاز سے لے کر اختتام تک فکر کی نئی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور انسان سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ان کے انشائیے ایسی گہری معنویت لیے ہوئے ہیں کے قاری پر نئی سوچ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ تازہ ہوا میں سانس لینے لگتا ہے۔ ایک گھٹن زدہ ماحول انشائیے کے پڑاؤ کے ساتھ ساتھ اپنے آپ ایک راہ متعین کرنے لگتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں سماج کے اجتماعی اور انفرادی تجربوں کا نچوڑ شامل ہے۔ جدید ادب کا مقصد ہی سماج کو ادب سے اور ادب کو سماج سے پہچاننے کی کوشش ہے۔ جو عصری مسائل اور اقدار کے بدلتے تناظر اور سماج کے پس پردہ محرکات کو پرکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان انشائیوں میں انسانی نفسیات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ انہوں نے فلسفیانہ اور نفیس انداز میں معاشرے کی اخلاقی اقدار کے حوالے سے بات کی۔ اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی مناسبت سے انگریزی ادبیات، مصنفین اور فلم کے کردار کو بھی بطور مثال پیش کرتے ہیں ان کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں اور ان سے اخذ شدہ اہم نتائج احسن طریقے سے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ جس سے ان کی علمی بصیرت کا انکشاف ہوتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح مذہبی حوالے اور تصوف ان کے انشائیوں میں سمایا ہوا ہے۔ مثلاً اصحاب کہف کا ذکر "بیماری" میں بنی اسرائیل کی قوم پر وقتاً فوقتاً عذاب کے نازل ہونے کا ذکر اور پھر بیماری کی بدولت جنم لینے والا روحانی سفر کہ کیسے جب انسان موت کے قریب ہوتا ہے تو روحانی اور جذباتی رشتوں کی سچائی پر ایمان لے آتا ہے۔ اسی طرح انشائیے فاصلے کی مثال بھی لی جا سکتی ہے جن کا جائزہ گزشتہ ابواب میں ہوا ہے۔

ایک معاشرے میں رہتے ہوئے دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ کسی کے ساتھ زیادتی یا حق تلفی نہ ہونے پائے تاکہ ایک مثالی معاشرہ پروان چڑھ سکے۔ تخلیق ادب ایک سماجی عمل ہے۔ ہر حساس شخص ظلم و بربریت پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ ادیب سماج کا حساس ترین کردار ہوتا ہے خارجی عوامل کا اثر اس کی افتادِ طبع پر بھی ہوتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا تنقیدی جائزہ لیں تو ان کے انشائیے سماج سے جڑے نظر آتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں افراد کا مثبت قدروں پر یقین اور عملی زندگی میں ان پر عمل کرنا معاشرے کو مثالی بنا دیتا ہے۔ اس کے لیے عرفان ذات ہی ناصر عباس نیر کے نزدیک زندگی ہے۔ اس سے

انسان کا نفس مطمئین رہتا ہے۔ انسان کا زندگی میں مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔ تصوف کی منازل پا کر وہ دوسروں کو آسانیاں فراہم کرنے لگتا ہے جو ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں رگ و پے سے سمویا ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں خیالات کی گونج اور صوفیانہ نقطۂ نظر کو فطرت کے حسین امتزاج سے ملا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں کا گہرا مشاہدہ اور تجربہ صوفیانہ انداز میں موضوع کے ساتھ پر جوش لگاؤ لیے نظر آتا ہے۔

تنہائی میں ناصر عباس نیر تنہائی کے دامن سے اٹھنے والے ان عظیم مقاصد سے روشناس کرواتے ہیں جو روز مرہ کے ہنگاموں کی وجہ سے حاصل نہیں ہو پاتے۔ ناصر عباس نیر نے بطور انشائیہ نگار اس صدی کے انسان کو اس کی ذات کی اصلیت سے ملوانے کی سعی کی ہے اور اسے اس کے دنیا میں آنے کے مقصد سے آگاہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ایک ایسے ادیب ہیں جو اچھائی اور برائی دونوں سے ملواتے ہیں، انسانی رویوں کو ان کے پورے وجود کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے معاشرتی رویوں کو انشائیوں میں بھرپور جگہ دی ہے؛ خراب اور ناہموار معاشرتی رویوں کا اظہار انھوں نے بے باکی سے کیا ہے۔

ادیب معاشرے کا وہ رہنما ہوتا ہے جو قلم کی طاقت سے لطیف پیرائے میں ان عوامل کا تجزیہ کرتا ہے جو معاشرے کی رگوں میں سرایت کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ خارجی مشاہدات کو اپنی داخلی کیفیات سے ملا کر فرد کو سوچ کی گہرائی سے منور کرنے کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے اس سماجی رویے جو مغربی یورپ اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جنم لیتا ہے اس کا اظہار کیا ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں وہ وحدت موجود ہے جو عام انسان کو بھی دنیا کی رنگینیوں سے ملوا کر زندگی کی ایک نئی لہر سے ملواتے ہیں۔ اخلاقی پابندیاں معاشرے کی طرف سے ہوتی ہیں۔ جن کا مقصد معاشرے میں اعلیٰ اقدار کا فروغ ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو اسی سلسلے کی ایک کڑی ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں ملتی ہے جو معاشرے کی نشو نما اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں تاکہ ایک مستحکم معاشرہ وجود میں آ سکے۔ انسان جن ناانصافیوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ ان سے نکل کر زندگی میں اعتدال اور توازن قائم کر سکتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیے انسان کو زندگی کی حقیقت اور مقصد سے روشناس کرواتے ہیں جس کی بدولت انسان اخلاقیات جو اسے معاشرے میں بہتر

طریقے سے زندگی گزارنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ سماج میں جب لوگوں کی اکثریت مثبت ہو گی تو انسانیت کا احترام کیا جائے گا وہ معاشرہ اتنا ہی صحت مند ہو گا۔

ان کے فلسفیانہ موضوعات بھی دنیا کے ان قوانین سے روشناس کرواتے ہیں جس تک عام ذہن پہنچنے کی جسارت نہیں کرتا۔ ان فلسفیانہ موضوعات میں ناصر عباس نیر نے کائنات کے پوشیدہ حقائق سے پردو اٹھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کے فلسفیانہ موضوعات انسان کے خیالات اور کائنات کی دقیق پہنائیوں میں لے جاتے ہیں اور تخیل کے دامن کو فکر کے موتیوں سے بھر دیتے ہیں۔ ان کے انشائیے فطرت سے قریب تر ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں شعوری اور لاشعوری سطح پر انسانی وجود کی شناخت کے مسئلے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ یہ سلسلہ صرف تہذیب واقدار اور انسانی رویوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ انہوں نے فرد کی سوچ کو مختلف زاویوں سے جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ہر انشائیہ فکر انگیزی کی دعوت دیتے ہوئے ختم ہوتا ہے۔ اپنے تجربات کا ادراک کرنے کے بعد وہ قاری کی توجہ اس طرف مبذول کروانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔

انشائیوں کے پڑاؤ اور تکمیل کے سلسلے میں ان کے انشائیوں میں جابجا ادبی دنیا سے مثالیں اور حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں جو ان کی ادب سے دلچسپی کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔ ان انشائیوں کی تکمیل کے سلسلے میں ناصر عباس نیر شعور کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے تجربات اور مشاہدات ان کے انشائیوں میں وہ حسن پیدا کرتے ہیں جو انشائیے کو خوبصورت اور دلکش بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے فطرت کی مسکراہٹوں کو احسن طریقے سے قلم بند کیا ہے۔ جس سے انسان زندگی کی دوڑ میں دوڑنے کی بجائے زندگی کا لطف اٹھانے لگتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں موضوعات اور اسلوب دونوں کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔

انہوں نے بوجھل پن اور اور فرسودگی سے ماوراہو کر فطرت کی لامحدود وسعتوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا بڑا ذخیرہ ہے پھر وہ اظہار ومطالبات کے لیے الفاظ کو مختلف انداز سے برتتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو فطرت اور خارجی مظاہر کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ناصر عباس نیر ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ان کا اسلوب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ان کا ہر موضوع ہر جملہ اظہار کی توانائی لیے ہوئے ہے۔یہ ایک ایسے فرد کا لہجہ محسوس ہوتا ہے جو اظہار کی پختگی لیے ہوئے ہے۔ان کا اسلوب انانیت کی بجائے فکر و تسلسل کی راہ پر گامزن ہے۔وہ تلخیوں، پریشانیوں، تنہائی اور رنج والم کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر ان مصائب سے جھنجھلاہٹ، چڑچڑاہٹ، یاس اور ناامیدی کی فضا قائم نہیں ہونے دیتے بلکہ سوچ اور فکر کی نئی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ان کے ہاں مشکل سے مشکل حالات ہی انسان کو صحیح معنوں میں زندگی جینے کا احساس دلاتے ہیں۔ان کا عام رویہ سوال اٹھانا اس کی روشنی میں بحث کرنا اس چیز کے دو پہلوؤں سے آشنا کروانا ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ان کے انشائیے شگفتہ رواں اور سادہ ہیں انہوں نے انشائیوں کو شگفتہ تر بنانے کے لیے تمام تر لوازمات کے ساتھ ساتھ زبان وبیان اور رموز واوقاف کا استعمال باخوبی نبھایا ہے۔ان کے اسلوب میں خیال آفرینی، گہرائی اور فکر انگیزی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

ان کے انشائیوں کا انفرادی اور اجتماعی شعور ان کے انشائیوں کو وسیع پس منظر عطا کرتا ہے۔ان کے انشائیوں کا مواد اور مطالعہ فکر اور تجسس کی فضا پیدا کرتا ہے۔ان کا اسلوب سنجیدہ اور تازگی کا حامل فکر و فلسفے سے مزین ہے۔انشائیہ اپنے آغاز سے ہی فکر کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔آغاز سے اختتام تک قاری نئی اور جانی پہچانی فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔ان تمام انشائیوں میں ادیب کی ذاتی اور جذباتی وابستگی نے موضوعات کو پر اثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے انشائیوں کے عمیق نظر مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ان کا شعور اور لاشعور مثبت رویے کا پرچارک ہے۔وہ مشکل سے مشکل حالت میں بھی نہ خود مایوس ہوتے ہیں نہ قاری کو مایوس ہونے دیتے ہیں منفی پہلوؤں کی بھی مثبت راہیں نکالتے ہیں۔ان کے انشائیوں کے موضوعات، زندگی اور اس کے متعلقات سے اخذ شدہ ہیں۔کسی بھی شے کو حقیر نہیں سمجھتے۔ہر بات اور تجربہ شگفتہ طرز فکر اور حال میں سوچ کے دھاروں کا مثبت سمت میں گامزن رہنا ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا خاصہ ہے۔

ناصر عباس نیر انسان کا رشتہ ہر پہلو سے فطرت سے جوڑنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔فطرت کے نظارے ان کے انشائیوں میں قاری کے لیے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات سے ان کا اسلوب بھرپور ہے۔خیالات کی واردات ان پر ایسے طاری ہوتی ہے جیسے وہ تنہائی میں قلبی واردات کا مقابلہ کرتے

ہوئے عرفان ذات کی منازل تک پہنچ گئے ہوں۔ جزئیات و لفظیات ان کے انشائیوں میں ایسی ہیں کہ جیسے قدرت نے قلبی واردات کے نتیجے یہ ان کو بطور انعام بخشی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیے دلچسپی اور دلکشی سے منور ہیں۔

وہ جدید نظریات کے بڑے نقاد ہیں۔ انہوں نے نو آبادیاتی عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی تاریخ کا بغور مطالعہ کرر کھا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں کی فضا نو آبادیاتی اور صنعتی دور کی پیداوار ہے۔ ساتھ ہی ان کے انشائیے جدیدیت کے غماز ہیں ان کی انشائیہ نگاری وسعت کی حامل ہے۔ موضوعات کا تنوع جو ان کے انشائیوں میں پایا جاتا ہے وہ انشائیوں کو وسعت عطا کرتی ہے۔ انہوں نے معمولی اور عام چیزوں میں بھی نئے معنی کشید کیے ہیں۔ عام اور معمولی معمولات بھی ان کے ہاں جہانِ معنی لیے ہوئے ہیں جو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔

انہوں نے دیگر ادبیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کا مطالعہ بخوبی کرر کھا تھا۔ لہٰذا زبان کے قواعد و ضوابط کو باخوبی سمجھتے ہیں جس سے ان کے انشائیوں میں زبان و بیان کی تمام تر خوبیاں ابھر آتی ہیں۔

انشائیہ ایک ادبی صنف ہے اور کامیاب انشائیہ وہی کہلاتا ہے جو ادبی معیار کو بر قرار رکھے اور اپنے پورے لوازمات کے ساتھ موجود ہو۔ ناصر عباس نیر کا تجربہ مشاہدہ انشائیے میں خوب ڈھلا ہے۔ مجموعی طور پر ہم انہیں ایک کامیاب انشائیہ نگار قرار دے سکتے ہیں ان کا انشائی شعور وزیر آغا کی صحبت میں پروان چڑھا اور انہوں نے آغاز سے ہی انشائیے کی تحریک میں شمولیت صنفِ ادب اختیار کر لی اور انشائیے کی صنف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا یہی وجہ ہے کہ آغاز سے ہی ان کے انشائیوں میں فنی پختگی نمایاں ہے۔ جس طرح ناصر عباس نیر جدید نظریات کے بڑے نقاد کے طور پر ابھر کر سامنے آئے اسی طرح ہمہ وقت افسانہ نگار اور بطور انشائیہ نگار بھی اردو ادب میں قابل قدر مقام پر فائز ہیں۔

تحقیقی نتائج

ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے موضوعاتی اور اسلوبی مطالعے کے تحت اس تحقیق کے لیے جو سوالات مرتب کیے گئے تھے ان کی روشنی میں جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں۔

ناصر عباس نیر نے ادبی زندگی کا آغاز تو بطور تنقید نگار کیا جو آپ کی شہرت کا باعث بنی لیکن جب انہوں نے انشایئے لکھے تو تمام تر فنی لوازمات کو پورا کر کے انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی نام پیدا کیا۔ موضوعاتی تنوع ان کے انشائیوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ ان کے موضوعات عام اور سادہ ہیں لیکن گہری معنویت لیے ہوئے ہیں مشینی دور کے مسائل کا حل فطرت میں تلاش کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے موضوعات جن میں سماجی، ادبی، نفسیاتی، فلسفیانہ، تصوف، اخلاقی شامل ہیں جن میں ناصر عباس نیر نے سماج کو دور جدید میں درپیش مسائل کا احاطہ کیا ہے جس میں سب سے بڑا مسئلہ مشینی دور کی پیداوار سے جو رشتوں میں کھوکھلا پن پیدا ہوا ہے اس کی عکاسی کی ہے اس سے پیدا ہونے والی تنہائی جو ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہے اس کی طرف ناصر عباس نیر کا زیادہ رجحان رہا اس کے علاوہ معاشرے میں چھپے وہ عناصر جو جرائم کا باعث بنتے ہیں ان کا بیان اور اکثر مغرب اور مشرق کا تقابل کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سب کے بیان کے لیے انہوں نے انسان کی نفسیات کو پیش پیش رکھا ہے۔ ادبی دنیا سے اس کے لیے مثالیں بھی پیش کی۔

جو بھی موضوع منتخب کرتے ہیں اس کا ہر پہلو سے جائزہ ذاتی تجربات اور تخیل سے لیتے ہیں اور قدم قدم پر قاری کو نئے انداز سے سوچنے کی دعوت دیتے ہیں اور بہتر زندگی گزارنے کے روشن پہلو دیکھاتے ہیں۔

ان کے چھوٹے چھوٹے سے موضوعات میں تنوع اور بڑی بڑی باتیں پیش کی گئی ہیں جو اخلاقی اقدار و روایات کی پاسداری کرتی ہیں۔ انہوں نے معمولی چیزوں کے بھی غیر معمولی پہلو بیان کیے ہیں۔

ان کا اسلوب انشائیے کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق ہے۔ناصر عباس نیر چونکہ خود نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیق کار بھی ہیں۔یہ اثر بھی ہے کہ ان کے تمام انشائیوں میں فنی لوازمات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

انشائیوں میں شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے جو معنی آفرینی اور نکتہ آفرینی پیدا کرتی ہے۔بات بات پر تشبیہات کا سلسلہ ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔جو بھی بات کرتے ہیں اس کے دو رخ متعین کرتے ہیں اور وضاحتی انداز اپناتے ہیں۔

ان کا اسلوب روانی، رجائیت، شگفتگی اور لطافت سے ترتیب پاتا ہے۔ وہ نئی سوچ سے آراستہ کرتے ہیں۔اور انسان کو ناامیدی کے لمحات میں امید کی کرن دیکھاتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے قاری کو نئے نئے زاویوں سے دیکھاتے ہیں۔ جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔

ان کے موضوعات اور اسلوب کا تعلق فطرت سے ہے جو قاری کو خود شناسی کے عمل سے گزارتا ہے۔ ان کے ہاں فطرت کا حسن اور اس میں کھو کر ان منازل کو طے کرنا ہے جن کو صوفی خاص اہتمام کرنے کے بعد حاصل کرتا ہے۔اس عمل سے ان کی ذات کے مہذب اور شائستہ پہلو ملتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں زندگی کے نئے آفتاب کی نمود کا پیغام ہے۔جس کو انہوں نے چراغ آفریدم کے استعارے میں قلم بند کیا ہے جس سے قاری اس دنیا میں شام و سحر کی بے کیفی سے نکل کر تازگی روشن خیالی اور نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے جو نہ صرف روشن صبح کا استعارہ ہے بلکہ اس منصب کا بھی جو ایک صوفی کو حاصل ہوتا ہے۔

سفارشات

۱۔ ناصر عباس نیر کے انشائیے جدیدیت کا رجحان لیے ہوئے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا مطالعہ جدیدیت کے تناظر میں اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

۲۔ ان کے انشائیوں کا معاصر انشائیہ نگاروں کے ساتھ تقابل کروایا جائے۔

۳۔ انشائیہ نگاری کے میدان میں مغربی اور مشرقی انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا تقابل کروانے کی ضرورت ہے تاکہ ان دونوں کے اسلوب اور موضوعات واضح ہو سکیں۔ اس ضمن میں ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا تقابل سلیم آغا قزلباش کے تراجم "مغرب کے انشائیے" کے ساتھ تقابل کروایا جا سکتا ہے۔

۴۔ ناصر عباس نیر کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے تحقیقی کام بھی ادب میں گراں قدر اضافے کا باعث ہو گا۔ اس حوالے سے بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے

۵۔ ناصر عباس نیر کے افسانوں کے حوالے سے بھی موضوعاتی اور اسلوبی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، بیکن بکس، ملتان، طبع دوم، ۲۰۱۴ء

ثانوی ماخذات

کتب

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، (مرتبہ) کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

احمد جمال پاشا، انشائیہ کی اصلاح، دہلی کتاب نما، نومبر، ۱۹۸۳ء

احمد امتیاز، ڈاکٹر، (مرتب) انشائیے کے فنی سروکار، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۶ء

اکبر حمیدی، (مرتب) جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۱ء

آل احمد سرور (مرتب) جدیدیت اور ادب، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء

بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء

جمیل آذر، پروفیسر، (مرتب) اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، طبع اول، ۱۹۷۶ء

جمیل آذر، پروفیسر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء

جاوید وشِشٹ، ڈاکٹر، انشائیہ پچیسی، سلوحیہ پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

خلیل صدیقی، زبان کیا ہے؟، بیکن بکس گلگشت، ملتان، ۲۰۰۱ء

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، پروفیسر، اصناف ادب، سنگ میل پبلکشنز لاہور، ۱۹۷۶ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۶ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء

شکیل الرّحمٰن، ادب اور نفسیات (انتقادی مقالات)، اشاعت گھر پٹنہ، ۱۹۵۱ء

شیما مجید، (مرتب) ادبی مذاکرے، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

صدف نقوی، گوہر ادب، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء

صفی حیدر دانش، پروفیسر، تصوف اور اردو شاعری، سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۴۸ء

صفی مرتضیٰ، سید، اردو انشائیہ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

عبداللہ، سید، ڈاکٹر، اشارات تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

عابد علی عابد، سید، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء

قدیر زماں، سوئے انشائیہ اور سوانحِ انشائیے، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء

کلیم الدین احمد، پروفیسر، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، س ن

گالینا کیریلنگو اور لیدیا کورشونووا، فلسفہ کیا ہے؟ دارالاشاعت "ترقی" ماسکو، س ن

معصوم رضا،سید،ڈاکٹر،اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا(۱۹۴۵ءتا۱۹۹۰ء) ،نیشنل پرنٹرس،روبی آرٹ پریس،دہلی،۲۰۰۵ء

محمد حسن، معاصرہ ادب کے پیش رو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع نگر، نئی دہلی،۲۰۱۱ء

محمد حسن،اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،۱۹۹۸ء

محمد اسد اللہ،"انشائیہ کی روایت"مشرق و مغرب کے تناظر میں ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،۲۰۱۵ء

محمد امین،ڈاکٹر،اخلاقیات(ایک تعارف)،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۲۰۱۸ء

نصیر احمد خان، پروفیسر،(مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ،اردو اکادمی، دہلی،۲۰۰۳ء

نصیر الدین احمد،سید، فکر تونسوی، شخصیت اور طنز نگاری، بوگس، حیدر آبادی عثمانیہ،۱۹۸۰ء

وحید قریشی،ڈاکٹر،اردو کا بہترین انشائی ادب، مکتبہ میری لائبریری،لاہور،۱۹۶۴ء

وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال، نئی آواز جامعۂ نگر، نئی دہلی،۱۹۹۱ء

ہاجرہ بانو،ڈاکٹر،اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار(ایک تجزیاتی مطالعہ)عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی،۲۰۱۳ء

یاسر جواد، فلسفہ مذاہب،تراجم،لاہور فکشن ہاوس،۱۹۹۸ء

یوسف سرمست،ڈاکٹر،ادب نقد حیات، مکتبہ جامعہ دہلی لمیٹڈ، علی گڑھ،۱۹۹۳ء

لغات / فرہنگ

اطہر حسین صدیقی، حسن اللغات اردو (جامع) اعتقاد پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)، جلد پنجم، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء،

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

شان الحق حقی (مرتبہ) فرہنگ تلفظ (نستعلیق ایڈیشن) ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۷ء

فیروزالدین، مولوی الحاج، (مرتب) فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز لمیٹڈ (پرائیویٹ) باز اول، ۲۰۱۰ء

کفایت اردو لغت، کیفایت اکیڈمی، اردو بازار کراچی، ۱۹۸۹ء

محمد عبد اللہ خان خویشگی، (مرتبہ) فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع دوم، ۲۰۰۷ء

نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات، جلد اول، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

نجیب رامپوری، نئی اردو لغت (جامع)، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ، طبع اول، ۲۰۰۴ء

وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع) نظر ثانی محمد حسن خان، علمی کتاب خانہ لاہور، س ن

انسائیکلوپیڈیا

The world broke encyclopedia, A world book Lync1986,4-S-A

رسائل / جرائد

اسالیب سہ ماہی، کتابی سلسلہ نمبر ۲۵، فروری تا مئی، ۲۰۱۸ء

انتخاب انشائیہ نمبر (مرتب)ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر روشن آراء راؤ، کاروان ادب، ملتان صدر، ۱۹۸۸ء

بازیافت ۲۹ شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء

چہار سُو، جلد ۲۶، شمارہ: مارچ، اپریل، ۲۰۱۷ء

عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد (مرتب) ارشد خالد، شمارہ ۲۱، ستمبر ۲۰۱۵ء

ماہنامہ قومی زبان، جلد: ۸۷، شمارہ: ۲ فروری، ۲۰۱۵ء

ماہنامہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، جلد ۳۴، شمارہ ۲۔۳ فروری۔ مارچ، ۲۰۱۶ء

مقالہ جات

رخشندہ مراد، ڈاکٹر، پاکستان میں غیر افسانوی اردو نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ، (غیر مطبوعہ) مقالہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

سائرہ بتول، ڈاکٹر، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (۱۹۶۰ء تا حال)، (غیر مطبوعہ) مقالہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

انٹرویو

ڈاکٹر ناصر عباس نیر سے مقالہ نگار کا انٹرویو، بذریعہ ٹیلی فون، ۱۳ اگست ۲۰۱۸ء، بروز جمعہ